وینکوور سے لائل پور تک

(سفرنامہ)

جرنیل سنگھ سیکھا



مترجم: طارق گوجر

ترجمہ نگاری! معاشروں کے درمیان ثقافتی پُل

عہدِ حاضر، اقوام، ثقافتوں اور زبانوں کی قربت کا متقاضی ہے۔ قربت کی یہ خواہش کسی حد تک تاریخ کے ہر دور میں موجود رہی ہے۔ تاریخ کے مختلف ادوار میں سیاح اور تاجر ایک ملک سے دوسرے ملک اور ایک براعظم سے دوسرے براعظم تک سفر کرتے رہے ہیں۔ اس سیاحت سے حاصل ہونے والی معلومات جہاں دوسری دنیاؤں سے متعلق معلومات فراہم کرتی رہیں وہیں ان ممالک میں تاریخ کے مختلف ادوار میں ہوئی انسانی ترقی کو ایک ملک سے دوسرے ملک میں منتقل کرنے کا باعث بھی بنتی رہی ہیں۔

موجودہ دور میں سائنس، ٹیکنالوجی اور ذرائع ابلاغ کی تیز رفتار ترقی نے انسانوں کو ایک دوسرے کے بہت قریب کر دیا ہے۔ مہینوں کے فاصلے گھنٹوں میں اور دنوں میں پہنچنے والی معلومات اور خبریں سیکنڈوں میں اپنا سفر طے کر لیتی ہیں۔ اس تیز رفتار ترقی نے پوری دنیا کے انسانوں، معاشروں اور ثقافتوں کے درمیان فاصلے کم کر کے حصولِ معلومات کی راہ میں حائل رکاوٹیں بڑی حد تک دور کر دی ہیں۔ تیز رفتار معلومات کے اس دور بھی میں کتاب جیسے مؤثر ذریعۂ ابلاغ کی اہمیت کم نہیں ہو پائی چنانچہ الیکٹرانک میڈیا

کے متوازی کتاب کا سفر آج بھی کامیابی سے جاری ہے۔انسانی تاریخ میں تخلیق وتحریر کے ساتھ ساتھ ترجمہ کی روایت بھی اتنی ہی پرانی ہے جتنی خود زبان کی تاریخ۔ جب ایک خطے کے لوگوں کا دوسرے سے رابطہ ہونا شروع ہوا تو زبان کو سمجھنے اور ترجمہ کرنے کا عمل شروع ہوا۔ترجمہ ایک خطے کے لوگوں کے علوم دوسرے خطے تک پہنچانے کا بہت موثر ذریعہ ثابت ہوا چنانچہ اہلِ ہند کا علمِ ریاضی یونان، یونانیوں کا فلسفہ عرب اور عربوں کی سائنسی کاوشیں لاطینی میں منتقل ہوئیں۔ پھر یہی علوم لاطینی سے یورپ کی زبانوں میں ترجمہ ہو کر پوری دنیا کی مشترکہ میراث بنے۔علوم کا بذریعہ ترجمہ یہ سفر اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ علم کسی ایک قوم کی میراث نہیں بلکہ نسلِ انسانی کا مشترکہ سرمایہ ہے۔اسی طرح تہذیبوں کا ارتقائی سفر ایک معاشرے سے دوسرے میں نفوذ کرتا ہے۔انسانی معاشرے کے آغاز سے لے کر آج تک ایک تہذیب دوسری سے مکالمہ کرتی آئی ہے۔ کتاب کا تبادلہ اس تہذیبی ملاپ کا ایک عمدہ ذریعہ ہے۔ ہندوستان کے دروازے پر ہونے کی وجہ سے پنجاب کی سرزمین تہذیبوں کے آپسی ملاپ کی ہمیشہ سے آماجگاہ رہی ہے۔اس تہذیبی ملاپ نے نسلی اور مذہبی تنوع کے ساتھ ساتھ لسانی رنگا رنگی کو بھی فروغ دیا ہے۔

پنجابی زبان کے دو رسم الخطوں گرمکھی اور شاہ مکھی کا ہونا اگرچہ اس زبان کی وسعت پر دلالت کرتا ہے تاہم ان دو بالکل الگ رسم الخطوں کے باعث دونوں ملکوں کے پنجابی عوام، بالخصوص پنجابی لکھاریوں کو ایک دوسرے کے جذبات واحساسات، خیالات اور ادب کو سمجھنے میں مشکل بھی پیش آتی ہے۔کینیڈا میں مقیم ناول نگار جناب جرنیل سنگھ سیکھا کے سفرنامے کو گرمکھی سے اردو میں منتقل کر کے طارق گوجر نے پاکستان، ہندوستان اور کینیڈا کے پنجابی لکھاریوں کو ایک سفرنامے کے توسط سے نہ صرف قریب لانے کی کوشش کی ہے بلکہ مختلف ثقافتوں، زبانوں اور معاشروں کے درمیان ایک پُل بنانے کی مثبت سعی بھی کی ہے۔ میری خواہش ہے کہ دنیا کے مختلف معاشروں کے درمیان اس طرح کے پُل بنتے رہیں تا کہ مثالی عالمی معاشرے کی تشکیل کا عمل صحت مندانہ انداز میں آگے بڑھتا رہے۔

جرنیل سنگھ سیکھا کینیڈا میں مقیم ممتاز پنجابی ناول نگار ہیں۔ پاکستان کے سفر میں ورلڈ پنجابی کانفرنس میں شرکت اور پھر فیصل آباد، ڈجکوٹ، رسیانہ اور ننکانہ صاحب کے سفر میں ان کی ملاقات بہت سے لکھاریوں اور زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق افراد سے ہوئی۔ جرنیل سنگھ سیکھا نے اپنے سفر نامہ میں بھی اُس گہرے مشاہدے اور جزئیات نگاری سے کام لیا جو ایک ناول نگار کا خاصہ سمجھا جاتا ہے اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے ایک ذمہ دار صحافی کے طور پر کانفرنس کے تمام سیشنز کی روداد لکھی۔ مجھے بھی اس کانفرنس میں شرکت اور ایک سیشن کی صدارت کا موقع ملا۔ کانفرنس کے تھیم، ثقافتی میل جول عالمی بھائی چارے اور نفرت کی بجائے محبت پر باہمی تعلقات کی استواری جیسے خیالات کی بازگشت سفر نامے کے صفحات میں جگہ جگہ سنائی دیتی ہے۔ یوں کانفرنس میں شریک ایک غیر ملکی ادیب نے مبصر کے طور پر بھی اپنی شرکت کا حق ادا کیا ہے۔ سلیس اور رواں تحریر میں لکھے گئے اس سفر نامے کو ترجمہ کرتے وقت طارق گوجر نے اصل متن کے مزاج کو برقرار رکھا ہے۔ چونکہ سفر نامہ پنجابی کلچر اور ماحول کو بیان کرتا ہے اس لیے ترجمہ کرتے وقت مترجم نے پنجابی زبان کی اصطلاحات، محاوروں اور بعض جگہوں پر متن کو معنی خیز بنانے کے لیے مخصوص الفاظ کو پنجابی میں ہی رہنے دیا ہے۔ بظاہر اس سے تحریر کی تفہیم میں کچھ رکاوٹ محسوس ہوتی ہے مگر اس نے سفر نامے کا اصل مزاج بھی برقرار رکھا ہے مزید براں مترجم کے اس تجربے سے اردو زبان کے ذخیرہ الفاظ میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ پاکستان کی ہمہ جہت لسانی ثقافت کے تناظر میں اردو زبان کی ساخت میں اس تنوع اور جِدّت کی ضرورت شروع سے ہی محسوس کی جاتی رہی ہے اور آئندہ بھی محسوس ہوتی رہے گی۔ طارق گوجر کی اس کاوش سے استفادہ کر کے اس روایت کو مزید آگے بڑھایا جاسکتا ہے۔ یہ روایت ہمارے قومی کلچر کی وسعت و پختگی کا وسیلہ بن سکتی ہے۔

مجھے خوشی ہے کہ طارق گوجر نے شاعری اور تخلیقی نثر کے بعد ترجمہ نگاری کے میدان میں بھی قدم رکھ دیا ہے۔ وہ مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے کینیڈا میں مقیم ایک معروف ادیب کے سفر نامے کو گرمکھی سے شاہ مکھی میں لِپی انتر کرنے کی بجائے اسے اردو کا

جامہ پہنایا ہے۔ اس سے جہاں یہ سفرنامہ اردو پڑھنے والے تمام قارئین تک پہنچ سکے گا وہیں یہ ترجمہ پاکستانی زبانوں کے ادب میں ترجمے کی روایت کو مزید فروغ دے گا۔

طارق گوجر جامعہ گجرات کے شعبہ پریس میڈیا اینڈ پبلی کیشنز میں اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ جامعہ گجرات کی انتظامیہ انکی ادبی خدمات سے آشنا ہے اور تخلیق و ترجمے کے میدان میں ان کی صلاحیتوں سے بھرپور فائدہ اٹھانے کی خواہش مند بھی۔ جامعہ مستقبل قریب میں پنجاب کی تاریخ، ثقافت، ادب اور فنون پر تحقیقی کام کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ تحقیق و تالیف کے اس منصوبے میں ان کی معاونت جامعہ کے لیے بڑی خوش آئند بات ہوگی۔

ڈاکٹر محمد نظام الدین

وائس چانسلر، یونیورسٹی آف گجرات

مٹی کی ایک مٹھ

پردیسوں میں رہنے والے پنجابی ہمیشہ پنجاب کی جنت کو ترستے رہے ہیں، وہ جنت جہاں سے وہ دانہ گندم کی تلاش میں سمندر پار کے دیسوں میں جانے پر مجبور ہوئے حالانکہ اُن کی اپنی دھرتی کی کوکھ گندم کے دانوں سے بھری ہوئی تھی۔ سنتالیس کی مہاجرت کے بعد سمندر پار جانیوالے پنجابی دوہری کشمکش کا شکار ہوئے۔ ایک تو تقسیم کے بعد نئے دیس (ہندوستان یا پاکستان) میں اُجڑ کر آنے کی کسک اور پھر وہاں سے بھی سمندر پار کی ہجرت، یوں ہجرت در ہجرت کا سفر ان کی نفسیات پر ثبت ہو کر رہ گیا۔ جو تخلیقی تھے وہ کسی نہ کسی طرح اس کرب کا اظہار کرتے رہے، باقی تمام عمر اس دوہری غریبی الوطنی کو کونجوں کی ڈار کی طرح جھیلتے رہے۔

کلونت سنگھ ندیم پر مارا انہی تخلیق کار پنجابیوں میں سے ہیں۔ وہ پیدا تو پھگواڑہ (مشرقی پنجاب) کے گاؤں پنچھٹ میں ہوئے مگر اپنی ماں کے ساتھ آج کے فیصل آباد کی تحصیل سمندری کے پنڈ بڑا رسیانہ میں رہے۔ اُجاڑے پڑے تو ساتویں جماعت میں تھے۔ ہجرت کے بعد پھگواڑہ اور پھر سات سمندر پار کی اڑان، ڈھیروں دولت کے ساتھ ساتھ

پنجابی اور اردو ادب میں نام کمایا، پاکستان میں ہونیوالی مختلف کانفرنسز میں آئے مگر وقت نے فرصت نہ دی کہ سمندری جا کر دوبارہ اس ہوا میں دوبارہ سانس لے سکیں جو آج بھی زندگی کی ضمانت کی طرح محسوس ہوتی ہے۔ 2005ء میں محترم فخر زمان نے ورلڈ پنجابی کانفرنس میں بلایا تو دل سے وعدہ کر کے چلے تھے کہ عقل کے جھمیلوں کی ایک نہ سنیں گے چنانچہ رسیانہ گئے، چند آنسو بہائے، مٹی کی ایک مٹھ اپنے ہینڈ بیگ میں ڈالی اور 58 سال سے دل میں بسی کسک کو اور بڑھا کر واپس کینیڈا آ گئے۔

ناول نگار جرنیل سنگھ سیکھا نے دوہری مہاجرت نہیں جھیلی۔ وہ موگا (فیروز پور) سے کینیڈا پدھارے، ندیم سے گھاٹی یاری ہوئی، اکٹھے ورلڈ پنجابی کانفرنس 2005ء میں آئے اور ندیم کے ہمراہ پوری ''سِک'' کے ساتھ ساندل بار گھومے، یوں لگ رہا تھا جیسے ان کے اندر بھی ندیم کے رسیانہ کی طرح کا کوئی گاؤں ہے، تبھی تو واپس کینیڈا جا کر انہوں نے اس گاؤں کی روداد لکھی اور یوں لکھی جیسے کوئی بچہ وچھوڑے کے دنوں کی کہانی اپنی ماں کو سناتا ہے۔ پنجابیوں کی یہ ہجر کہانی ابھی ادھوری ہے۔ ابھی وچھوڑے کے مارے بچوں کو ماں کے سامنے بہت کچھ کہنا ہے۔ جرنیل سنگھ سیکھا نے تو کہانی کو صرف آغاز دیا ہے۔

گُرمکھی سے شاہ مکھی میں لپی انتر کی بجائے اردو میں ترجمہ کی تحریک مجھے اپنے استاد محترم جناب ڈاکٹر اسلم ادیب صاحب سے ملی جو خود بھی اعلیٰ پائے کے نثر نگار اور دل موہ لینے والے مقرر ہیں۔ ان سے اگرچہ ہم ایم فل ایجوکیشن کی کلاس پڑھتے تھے مگر دنیا بھر کے سماج، کلچر اور روّیے زیرِ بحث رہتے تھے۔ اردو زبان و ادب سے اپنے گم گشتہ تعلق کو میں نے انہی دِنوں میں دوبارہ دریافت کیا۔

پنجابی زبان کے رسم الخط گُرمکھی میں چھپا یہ سفر نامہ جہاں فنی لحاظ سے بہت سلیس اور رواں ہے وہیں شخصیات، واقعات اور مباحث کو بیان کرتے وقت بہت توازن سے کام لیا گیا ہے۔ ہوسکتا ہے جرنیل سنگھ سیکھا باقی دنیا کو پاکستانی پنجاب کے متعلق ''سب اچھا ہے'' کی رپورٹ دے کر اپنی محبت کی تشفی چاہتے ہوں مگر درحقیقت انہوں نے جو دیکھا اسے بلا کم

وکاست پیش کر دیا ہے۔ ترجمہ کرنے کے بعد میں نے انہیں مسودہ ایک نظر دیکھنے کے لیے بذریعہ ای میل بھیجا، ان کے کمپیوٹر میں ان پیج نہ تھا لہٰذا فائل نہ کھل سکی لیکن ان کی محبت کو یہ گوارانہ ہوا کہ وہ مجھ سے پوسٹل کے ذریعہ مسودہ منگوائیں چنانچہ انہوں نے اسے بغیر پڑھے چھاپنے کی اجازت دے دی، لہٰذا اگر ترجمے میں کوئی کمی یا کوتاہی رہ گئی ہو تو اس کا براہِ راست ذمہ دار میں ہی ہوں۔

مَیں اور میرے سجن عنایت اللہ عاجز سفرنامے کے بیشتر مراحل میں جرنیل سنگھ سیکھا اور ندیم پرمار کے ساتھ رہے۔ ورلڈ پنجابی کانفرنس 2005ء سے لیکر ڈجکوٹ میں میرے چچا چوہدری عبدالرشید کسانہ کے گھر محبتوں بھری گفتگو، رسیانہ میں اپنے سکول، گھر، باغ اور بہن کی قبر کو دیکھ کر ندیم کی جذباتی کیفیت (اس کو دیکھ کر ہم سب کی آنکھیں بھر آئیں تھیں)، دربار شیر شاہ ولیؒ (ڈجکوٹ) پر حاضری، پچھلے قدموں باہر نکلنے کا عقیدت بھرا منظر اور عنایت کے والد صاحب سے اجاڑے کے دنوں کی کہانی سن کر دونوں مسافر دوستوں کی آنکھوں میں تیرتے آنسو، اس طرح کے کئی مناظر تھے جو ہم نے اس یادگار سفر میں سانجھے کیے۔ آج بھی اس سفر کی یاد آتی ہے تو دل میں ایک محبت آمیز سی کسک محسوس ہوتی ہے۔

ترجمہ جولائی، اگست 2008ء کے مہینوں میں کیا، لیہ کے چک نمبر 304/TDA میں اپنے باغ میں جامن کی چھاؤں میں ترجمہ کرتے وقت بیٹیوں نہال، نایاب اور ایک سالہ رحیم الدین کو مٹی میں کھیلتے دیکھ کر مجھے ''مٹی کی اس مٹھ'' کا بار بار خیال آتا رہا جو رسیانہ کے اس باغ میں سے اٹھا کر ندیم پرمار نے اپنے بیگ میں سنبھال لی تھی جہاں کبھی اس کا بچپن کھیلا کرتا تھا۔ مجھے پتہ ہے کہ اس طرح کی مٹی کی کتنی مُٹھیں پردیسوں میں بسنے والے پنجابی کیسے سنبھال سنبھال کر رکھتے ہیں اور ان کے علاوہ کتنے وہ ہیں جو مٹی کی اس خشبو کو ترستے ترستے قبرستانوں اور شمشانوں میں جا سوئے ہیں۔

اس کتاب کے ترجمے اور اسکی اشاعت کے مراحل میں مجھے بہت سے دوستوں کی محبتیں نصیب ہوئیں۔ میرے بھاء جی خالد محمود کسانہ جو ہمیشہ گھنے برگد کی طرح مجھ پر اپنی

چھاؤں تانے رکھتے ہیں۔ فتح پور کی سنگت ''سانجھ'' کے احباب کے ساتھ ساتھ محمد سلیم، ملک حنیف کھرل، چوہدری جمیل اختر، چوہدری انوار الحق اور خالد عمران علوی جیسے ''یارانِ غار'' اور یونیورسٹی آف گجرات میں میرے فکری قبیلے کے سنگی شیخ عبدالرشید، مسعودالرحمٰن چھبر، سیّد شبیر حسین شاہ، ہمایوں غوری اور زاہد بلال کہ جن کے ساتھ گفتگو نے ہمیشہ مجھ پر تاریخ اور زبان وادب کے نئے دروا کیے۔ محترم فخر زمان اور محترم ڈاکٹر محمد نظام الدین کی آراء نے اس سفر نامے کے جواز اور ترجمے کی معنویت میں جو اضافہ کیا ہے اس کے لیے میں ان دونوں ہر دلعزیز ہستیوں کا تہ دل سے ممنون ہوں۔

آخر میں پنجاب کی بھوری مٹی کی اس مٹھ کا شکریہ جو سات سمندر پار بسے پردیسیوں کو واپس کھینچ لائی اور جس کی محبت کو اس سفر نامے کے ترجمے کے ذریعے میں آپ کے ساتھ سانجھا کر سکا۔

طارق گوجر

ریسرچ آفیسر، پریس، میڈیا اینڈ پبلی کیشنز

یونیورسٹی آف گجرات

tariqgujar@gmail.com

پاکستان کے لیے تیاری

جب وینکوور کی دھرتی پر جون 2003ء میں عالمی پنجابی کانفرنس منعقد ہوئی تھی تو اس میں شمولیت کے لیے پاکستانی وفد کو ویزے نہیں ملے تھے جس کی وجہ سے منتظمین کو بہت مایوسی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ میں بھی اُس کانفرنس کے منتظمین میں شامل تھا اور پاکستانی پنجابی لکھاریوں کو ملنے اور اُن کے ساتھ ادبی سانجھ بنانے کا آرزومند تھا مگر یہ آرزو حسرت بن کر دِل میں دَبی رہ گئی۔ اُس کے بعد عالمی پنجابی کانگریس کی جانب سے مختلف ممالک میں کانفرنسیں منعقد ہوئیں مگر میں اُن میں شامل نہ ہوسکا۔ چنانچہ پاکستانی پنجابی لکھاریوں سے میل کی خواہش پوری نہ ہوسکی۔

جنوری 2005ء میں ڈاکٹر درشن گل نے وینکوور آ کر بتایا کہ اپریل 2005ء میں لاہور میں عالمی پنجابی کانفرنس ہو رہی ہے اور اس میں کینیڈا کی طرف سے بھی ایک وفد جائے گا۔ ڈاکٹر درشن گل ورلڈ پنجابی کانگریس، کینیڈا کے صدر ہیں اور جناب فخر زمان کانگریس کے چیئرمین ہیں۔ ڈاکٹر درشن گل کی خواہش تھی کہ کینیڈا سے کم از کم دس رُکنی وفد ضرور لاہور جائے۔ اُن کے کہنے پر دل نے فوراً حامی بھری اور گُرنانک دیو جی کی جنم دھرتی

پاکستان اوراپنی جنم دھرتی ہندوستان جانے کی تیاری شروع کردی۔ پاکستان کے لیے ویزا بھی کینیڈا سے ہی حاصل کرلیا۔ جب مارچ کے آخر تک بھی کانفرنس کے منتظمین کی طرف سے دعوت نامہ موصول نہ ہوا، تو میں مایوس ہونے لگا ڈاکٹر درشن گل کوفون کیا ''ڈاکٹر صاحب دعوت نامہ ابھی تک نہیں ملا، کہیں کانفرنس ملتوی تونہیں ہوگئی۔''

''آپ دعوت نامے کا فکرنہ کریں۔ دعوت نامے میرے پاس پہنچ چکے ہیں۔ آپ فخرزمان جی کواپنے کوائف بھیج دیں۔کانفرنس کو بھلا ہم ملتوی ہونے دیتے ہیں؟ ندیم، امرجیت صوفی اور باقی دوستوں نے ویزے کے لیےاپلائی کردیا ہے۔''

ڈاکٹرگل کےالفاظ سن کردل مطمئن ہوگیا۔

اب ذہن میں کئی خیالات سراُٹھانے لگے۔ پاکستان کےگردواروں کے درشن کی بھی آرزو تھی اورکانفرنس میں کینیڈااورانگلینڈ سے جانے والےدوستوں سے کئی موضوعات پرتبادلہ خیال بھی کرنا تھا۔ ہربیرسنگھ بھنور کے بہو بیٹے، وساکھی پر بھارت جانے والےسکھ یاتریوں کےساتھ جارہے تھے۔بھنور نے رائے دی کہ یہاں سے قافلے کےساتھ جاؤں اورگردواروں کے درشن کر کے 16 اپریل کولاہورآ کر کانفرنس میں شامل ہوجاؤں مگرموگا (نیاضلع جو پہلےضلع فیروز پورکی تحصیل تھا) سے کچھ دوست سکھ قافلوں کےساتھ پاکستان ہو آئے تھے۔انہوں نے کہا کہ قافلے کےساتھ جانا ہماری تو مجبوری ہےلیکن آپ کے لیے کون سا مسئلہ ہے۔ آپ لوگ فرصت کے دِنوں میں آرام سے گردواروں کے درشن کریں۔قافلے کےساتھ رش میں بہت خواری ہوگی لیکن کچھ احباب بضد تھے کہ قافلے کے ساتھ جانے کا اپنا ہی مزا ہے۔

میں ابھی شش و پنج میں ہی تھا کہ ندیم پرمار کا فون آ گیا۔''سیکھا! میں نے ویزے کے لیےاپلائی کردیا ہے۔صوفی بھی کوشش کررہا ہے۔ میں اوردرشن اکٹھے ہی انڈیا آرہے ہیں۔سیٹیں بک ہوچکی ہیں۔ہم تینوں اکٹھے واہگہ کے راستے پاکستان پہنچیں گے۔''

ندیم کےفون نے قافلے کے ساتھ جانے یا نہ جانے کا مسئلہ حل کردیا۔ اُس

کا فون حکم کے انداز میں تھا۔ اب ندیم پرمار اور درشن گل کا انتظار ہونے لگا۔ اُدھر پنجاب (مشرقی پنجاب) سے بھی لگ بھگ دوسو لکھاری اس کانفرنس میں شرکت کی خاطر ویزے کے حصول کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔ وہ سب آس، نراس کے بھنور میں تھے۔ دیپک من موہن اور ڈاکٹر ستندر سنگھ نور سب ساتھیوں کو اُمید کے چپو پکڑائے حوصلہ دے رہے تھے۔

ندیم پرمار اور ڈاکٹر روشن گل 13 اپریل کی صبح کو چندی گڑھ پہنچ گئے سہ پہر کو جب میں نے ڈاکٹر گل کو فون کیا تو اُس کے الفاظ تھے۔ ''تیرا بندہ لے آئے ہیں، اس کے ساتھ انارکلی کی سیر یں کرنا، کرو بات اُس سے۔''

''کیا پروگرام ہے۔'' خیر خبر کے بعد ندیم نے پوچھا۔

''پروگرام تو تمہارے ساتھ ہی ہے۔ بتاؤ اب کہاں ملا جائے اور کب اور کہاں سے لاہور کے لیے روانہ ہوا جائے۔'' میرا جوابی سوال تھا۔

''درشن تو نہیں جا رہا، اُس کی اپنی مصروفیات ہیں، صوفی کو ویزا نہیں مل سکا، وڑائچ پہلے ہی وہاں گیا ہوا ہے، ہم دونوں ہی ہیں۔''

''ہم دونوں ہی نہیں، یہاں سے سڑک نامہ ہے گرگ اور ستیش بھی تیار ہیں۔ انہیں ویزا ملنے کی پوری اُمید ہے۔'' ندیم پرمار نے میری بات کاٹتے ہوئے مزید کہا ''ویسے تو ڈاکٹر جگیر صاحب کو بھی ویزا مل جائے گا۔ ہم اُن کی گاڑی میں بھی جا سکتے ہیں، آج میں پھگواڑہ جا رہا ہوں وہاں سے فون کروں گا۔''

ڈاکٹر درشن گل کے ساتھ نہ جانے کا سن کر مایوسی ہوئی۔ میں نے ستیش گلاٹی کو فون کر کے ویزے کے متعلق پوچھا تو اُس نے کہا ''ڈاکٹر دیپک من موہن ایمبیسی میں تمہارے لیے بیٹھے ہیں۔ ننانوے فی صد اُمید ہے کہ ویزے لگ جائیں گے۔ ہم اکٹھے قافلہ بنا کر چلیں گے۔'' سن کر من کو حوصلہ ہوا۔

14 اپریل کو سہ پہر کے وقت پھگواڑے سے ندیم کا فون آ گیا۔ ''کل دوپہر

بھائی رندھیر سنگھ نگر لدھیانہ میں درشن کو اُس کے دفتر میں ملیں گے۔ رات لدھیانہ ٹھہریں گے اور صبح سویرے ہی بارڈر کی طرف چل پڑیں گے۔''

''ٹھیک ہے میں دو بجے تک درشن کے پاس پہنچ جاؤں گا۔'' میرا جواب تھا۔

میں سوٹ کیس میں کپڑے رکھ رہا تھا کہ بلدیو سنگھ سڑک نامہ کا فون آ گیا'' کل کا کیا پروگرام ہے۔''

''کل لدھیانے جا کر ٹھہریں گے، آپ کو ویزا ملا؟''

''ویزا کہاں! پچھلی کانفرنس کے موقع پر ہمیں بارڈر سے بیرنگ واپس مڑنا پڑا تھا۔ کہا گیا تھا کہ تیار ہو کر آ جانا ویزے بارڈر پر لگ جائیں گے۔ اس مرتبہ اگر کل تک ویزا مل گیا تو چلے چلیں گے ورنہ پروگرام کینسل پچھلی مرتبہ کی طرح خوار نہیں ہونا۔ میں نے کل لدھیانے جانا ہے، چھوٹا سا کام ہے۔ ستیش سے ویزے کے متعلق بھی معلوم ہو جائے گا۔''

''پھر تو آپ کے ہمراہ ہی لدھیانے نکل جاتا ہوں۔ میں نے اسی لیے فون کیا تھا کہ آپ کے پاس اٹیچی بھی ہوگا۔ ہم نے گاڑی تو لے کر جانی ہی ہے۔ ساتھ ہی آپ کو بھی لے چلیں گے۔ ہم صبح نو بجے روانہ ہوں گے۔''

''میں تیار ہو کر نو بجے آپ کے ہاں پہنچ جاؤں گا۔ آپ نے تو میرا مسئلہ ہی حل کر دیا، میں نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔''

اگلے روز میں بلدیو کے ساتھ موگا سے لدھیانے پہنچ گیا۔ ابھی صبح کے گیارہ ہی بجے تھے۔ درشن اگلی کلاس کے انٹرویو میں مصروف تھا۔ میں نے کچھ دیر اُس سے باتیں کیں۔ پھر اُس کے کمرے میں اے۔سی چلا کر لیٹ گیا۔ نیند نہ آئی تو دوبارہ درشن کے دفتر آ گیا۔ درشن ایک لڑکی کا انٹرویو لے رہا تھا۔ وہ لڑکی انگریزی فراٹے دار بول رہی سی۔ وہ بڑے پُراعتماد طریقے سے باتیں کر رہی تھی۔ جب لڑکی اور اس کا باپ چلے گئے تو درشن نے اپنے چہرے پر اطمینان ظاہر کیا اور بولا'' سیکھا، تم نے دیکھا کہ یہ لڑکی پینڈو ہونے کے باوجود کیسے فر فر انگریزی بول رہی تھی۔ لڑکی میں کتنا اعتماد تھا میں تو ایسی لڑکیوں کو ترجیح دیتا ہوں۔''

اس کے بعد دو عورتیں دفتر میں داخل ہوئیں۔ اُن میں سے ایک لمبی اور بھرے بھرے جسم والی خوبصورت لڑکی تقریباً ۲۵، ۳۰ سال کے قریب ہوگی۔ عورت گٹھے ہوئے جسم والی درمیانے قد اور عمر کی تھی۔ انہوں نے پہلے نینی کے کورس کے متعلق جانکاری لی۔ اس کے بعد درشن نے پوچھا کہ اُن میں سے کس نے کورس میں داخلہ لینا ہے اور اُس کی تعلیمی قابلیت کیا ہے۔ بڑی عمر والی عورت نے بتایا کہ یہ لڑکی کورس کر کے کینیڈا جانا چاہتی ہے۔ اس نے ایم۔ بی۔ اے کر کے ایم۔ فل کیا ہوا ہے۔ آج کل یہ کالج میں لیکچرار ہے۔ اُس لڑکی کی تعلیمی قابلیت اور کینیڈا جانے کی خواہش جان کر میں سن ہو کر رہ گیا۔

درشن نے اُن کو سمجھانے کی کوشش کی ''اس جیسی لائق اور اچھی جاب والی لڑکیاں پنجاب میں بہتر زندگی گزار سکتی ہیں۔ ٹرینگ دینا میرا کام ہے۔ داخلہ دینے میں مجھے کوئی عذر نہیں لیکن آپ ٹھنڈے دماغ سے ذرا سوچ لیں۔'' درشن نے اُن کے ساتھ میرا تعارت کرواتے ہوئے اُن سے میرے دونوں ناول پڑھنے کو کہا تا کہ وہ کینیڈا کی ذرا مختلف جھلک دیکھ سکیں۔ معلوم نہیں وہ درشن کی باتوں سے مطمئن ہوئیں یا نہیں مگر اپنا داخلہ کنفرم کروائے بغیر وہاں سے واپس چلی گئیں۔ اس کے بعد پانچ اور لڑکیاں لڑکے داخلے کے لیے آئے مگر اُن کی انگریزی کمزور ہونے کی وجہ سے اُنہیں پہلے انگریزی کلاسیں لینے کا مشورہ دے کر ٹال دیا گیا۔

ندیم پرمار چار بجے کے قریب پھگواڑے سے آ گیا اور ہم درشن کی وین میں ''پنجابی بھون'' آ گئے۔ ستیش گلاٹی اپنی بک شاپ میں ہمارا منتظر تھا۔ اُس کے ساتھ ڈاکٹر گُر اقبال بھی تھے۔ وہ ہمیں گرمجوشی سے ملے۔ ستیش نے بتایا کہ ویزے ابھی نہیں ملے مگر ملنے کی اُمید پوری ہے، ڈاکٹر دیپک من موہن ابھی تک دلی میں پاکستان ایمبیسی میں بیٹھے ہیں۔ صدر پاکستان جنرل مشرف کے دلی آنے کی وجہ سے ایمبیسی کے زیادہ تر اہل کار اُن کے دورے کے انتظامات میں مصروف ہیں۔ اس کی وجہ سے ویزے ملنے میں دیر ہو رہی

ہے۔ستیش نے دکان میں بیٹھے بیٹھے دوبارہ دیپک کا فون ملایا۔ دیپک کا کہنا تھا کہ ۹، ۱۰ بجے تک ویزے ملنے کا پورا امکان ہے۔اپنے دستوں کو تیار رہنے کی اطلاع کر دیں۔فون سن کہ ستیش کے چہرے پر رونق آ گئی۔ وہ بارڈر پر جانے کے بارے میں کہہ رہا تھا کہ ہم سب اپنی گاڑی میں چلیں گے۔''ہمارے ساتھ کون کون جائیں گے۔'' ابھی یہ بات ہو ہی رہی تھی کہ ڈاکٹر جگتار کا فون آ گیا۔ وہ بھی ویزے کے متعلق ہی پوچھ رہا تھا، کہہ رہا تھا کہ میرا پاسپورٹ بھی لیتے آ نا۔ساتھ ہی یہ بھی کہہ رہا تھا کہ مجھ سے لاہور نہیں جایا جائے گا۔ندیم نے بھی اُس سے فون پر بات کی اور کہا کہ وہ تیار رہے۔ہم جلندھر سے گزرتے ہوئے اُسے بھی پک کر لیں گے۔مگر اُس کی نہیں نہیں سن کر کہنے لگا اب کہہ رہا ہے میں نہیں جاؤں گا، پھر کہے گا وین میں میرے لیے بھی تھوڑی سی جگہ رکھ لینا۔

''اور کسی کو ویزا ملے نہ ملے اُسے تو مل ہی جائے گا اور اُس نے جانا بھی ضرور ہے۔ مجھے اُس کے مزاج کا علم ہے۔''ستیش نے ہنستے ہوئے کہا۔

شام کے ۱۰ بج رہے تھے۔ میری رائے تھی کہ میرے بھتیجے دیوندر سیکھا کے گھر رات گزاری جائے۔مگر ستیش نے زور دے کر اپنے گھر ٹھہرنے کے لیے منا لیا۔ میں اُس کی فیملی کی طرف سے کی گئی آ وَ بھگت کا پہلے بھی آنند لے چکا تھا۔ہم بلا تکلف اُس کے گھر چلے گئے۔وہاں ستیش کے نامور ناول نگار باپ شاہ چمن جی نے ہمیں ''جی آیاں نوں'' کہا۔گھر میں کتابوں کے ڈھیروں نے تو پہلے ہی ادبی ماحول بنایا ہوا تھا۔ جب چار لکھاری جڑ بیٹھے تو ادبی تقریب جیسا ماحول بن گیا۔زیرِ طبع نئے ناول، کہانیوں اور غزلوں سے ہوتی ہوئی گفتگو پنجابی کانفرنس پر پہنچ گئی۔گفتگو کے دوران ڈاکٹر رگھبیر سنگھ کا فون آ گیا۔ وہ ویزوں کے متعلق پوچھ رہے تھے۔مگر جا نہیں رہے تھے۔انہیں جب پتہ چلا کہ میں اور ندیم پر مار اُس کے شہر میں ٹھہرے ہوئے ہیں تو انہوں نے ہمیں پاکستان کے دورے کے لیے نیک تمنائیں دان کیں۔فون بند ہوا ہی تھا کہ ڈاکٹر جگتار کا فون پھر آ گیا۔

وہ کہہ رہا تھا''میرا پاسپورٹ ضرور لیتے آ نا۔''ستیش نے ہنستے ہوئے کہا''بے

فکر ہو جاؤ۔'' ہم آپ کا پاسپورٹ بھی لیتے آئیں گے اور وین میں آپ کے لیے سیٹ بھی۔ آپ بس تیار رہیں۔''

فون سے فراغت پا کر ہم کھانا کھانے لگے۔ کھانا کھاتے کھاتے ساڑھے دس بج گئے مگر ڈاکٹر دیپک من موہن کا فون نہ آیا۔

میں نے ستیش سے کہا شاید دیپک جی پاسپورٹوں کی سانبھ سنبھال میں ہی مصروف ہوں۔ آپ کو فون کر کے پتہ کر لینا چاہیے۔ ستیش نے فون ملایا تو دیپک نے جواب دیا۔ ''صدر پاکستان کی آمد کی وجہ سے ایمبیسی خالی پڑی ہے۔ ایک دو اہلکار ہی موجود ہیں انہوں نے آج ویزے جاری کرنے سے انکار کر دیا ہے۔''

ستیش نے مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے فون میز پر رکھ دیا۔ اُس نے ویزے نہ ملنے کے ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ دلی میں افواہ گرم ہے کہ کانفرنس ہی ملتوی ہو گئی ہے۔

پھر ستیش ہمیں پوچھنے لگا کہ تمہارا اب کیا ارادہ ہے میں نے جھٹ سے جواب دیا کہ کانفرنس ملتوی ہو یا کینسل ہم دونوں تو ضرور جائیں گے۔ کانفرنس نہ بھی ہوئی تب بھی ہم پاکستان کے مقدس گردواروں کے درشن کریں گے۔

میں تو اپنی ''جمن بھومی'' دیکھنے کی آرزو لے کر کینیڈا سے چلا تھا۔ میں اپنی جنم بھومی دیکھ کر ہی واپس آؤں گا۔ ندیم نے بھی پختہ لہجے میں جواب دیا۔

''ٹھیک ہے۔'' ستیش بولا ٹیکسی کی کوئی ضرورت نہیں میں خود تمھیں بارڈر تک چھوڑ کر آؤں گا۔ یہاں کے معاملات کو تو میں نے پہلے ہی اس طرح ترتیب دے لیا ہے کہ پانچ دنوں تک کوئی مصروفیت نہیں۔ تمہیں بارڈر پر چھوڑنے کے ساتھ ساتھ امرتسر کے کچھ کام بھی نمٹا آؤں گا۔

کانفرنس کے ہونے یا نہ ہونے کی کڑواہٹ لے کر ہم بستروں میں پہنچ گئے۔

OOO

لاہور کو روانگی

۱۶/اپریل کی صبح، سورج ابھی نہیں نکلا، ہم سفر کے لیے تیار ہو کر ناشتے کے لیے میز پر بیٹھے ہی ہیں کہ انگریزی اور پنجابی اخبار آ گئے۔ سب اخبارات کی مین سرخی تھی ''بارہویں عالمی پنجابی کانفرنس ملتوی''، ستیش کی طرف سے رات کو سنی افواہ سچ ثابت ہو گئی تھی۔ خبر میں۔ پال کے وسیلے سے دی گئی تھی وجہ پاکستانی صدر کا دورہ ہی تھا۔

خبر میں بتایا گیا تھا کہ بھارتی ڈیلی گیٹس کو ویزے نہ ملنے کے باعث کانفرنس ملتوی کی گئی تھی۔

''یہ پال کون شخصیت ہے۔'' میں نے ستیش سے پوچھا۔

''یہ چنڈی گڑھ میں ایک بُک شاپ کا منیجر ہے۔ اس کے ذریعے بھی بہت سے لکھاریوں نے ویزے کے لیے پاسپورٹ بھیج رکھے ہیں۔ فخر زمان جی نے پال کو بھی اتھارٹی دی ہوئی ہے لیکن ہمارے پاسپورٹ تو دیپک من موہن کے ذریعے گئے ہیں ستیش کے چہرے پر گھمبیرتا آ گئی تھی۔ وہ ہمیں کچھ بتانے سے جھجکتا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ شاعر کے ساتھ ساتھ بزنس مین ہونے کی وجہ سے بھی کسی کے متعلق کوئی تبصرہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''مجھے تو لگتا ہے یہ سوفی صد افواہ ہی ہے۔'' میں نے کہا۔

''افواہ ہو بھی سکتی ہے۔'' ستیش بولا۔

ہم نے ناشتہ ختم کیا ہی تھا کہ میرا موبائل کھڑک اُٹھا۔ میرا بیٹا نونیت سنگھ موگا سے بول رہا تھا ''میں نے ابھی ہندوستان ٹائمز اور اجیت میں خبر پڑھی ہے کہ لاہور والی کانفرنس ملتوی ہوگئی ہے۔ اب آپ کا کیا پروگرام ہے، میں اور ندیم جا رہے ہیں۔ پھر کبھی موقع ملے یا نہ ملے اور نہیں تو مقدس گردواروں کی یاترا ہی کر آئیں گے۔ موقع ملا تو لاہور جا کے ہی فون کروں گا۔'' میں نے اُسے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

''یہ آپ نے ٹھیک سوچا۔ میں نے بھی یہی کہنے کے لیے فون کیا تھا کہ آپ واپسی کا ارادہ نہ کریں۔'' نونیت نے بھی پاکستان جانے کی ترغیب دی۔ ''کس کا فون تھا؟'' ندیم نے پوچھا۔

''نونیت کا، اُس نے بھی کانفرنس ملتوی ہونے کی خبر پڑھ لی ہے وہ ہمارا آئندہ پروگرام پوچھ رہا تھا۔''

ستیش بھی یہی کہہ رہا تھا کہ آپ الگ الگ ہوتے تو اور بات تھی۔ اب تو دونوں کا ساتھ ہے۔ خوب انجوائے کرو گے۔ ستیش کے بیٹے سنی نے گاڑی گراج سے نکال کر سڑک پر کھڑی کر دی۔

ستیش نے رات ہی اپنے ڈرائیور کو صبح آٹھ بجے پنجابی بھون پہنچنے کے لیے تاکید کر دی تھی۔ ہم جب پنجابی بھون پہنچے تو اس کا ڈرائیور پہلے ہی پہنچا ہوا تھا۔ ستیش نے کتابوں کے کچھ بنڈل کار کے اندر رکھے اور کار کو امرتسر کی طرف دوڑا دیا۔

ستیش کو پورا یقین تھا کہ کانفرنس ملتوی ہوگئی ہے اور اُن کے ویزے راج نیتی کی نذر ہو گئے ہیں۔ ہمیں تو پنجاب کی ادبی سیاست کی کوئی جانکاری ہی نہیں تھی۔ اُس کے پاس پاسپورٹ بھی نہیں پہنچے تھے اس لیے جلندھر میں ڈاکٹر جگتار کے ہاں جانے کا کوئی تُک نہیں تھا۔ سو ہم جلندھر کے بنے نئے بائی پاس سے گزر گئے۔

اب ہماری باتیں لاہور کے اردگرد ہی گھوم رہی تھیں۔ میں تو اپنی سوچ کو انارکلی بازار کی سیر کروا رہا تھا اور ندیم کہہ رہا تھا کہاوت ہے کہ :

''جہنے لاہور نہیں ویکھیا، اوہ جمیا ای نہیں۔''

(جس نے لاہور نہیں دیکھا وہ پیدا ہی نہیں ہوا)

''فیر میں تے جمن جا رہیاں۔''

(پھر میں تو پیدا ہونے کے لیے جا رہا ہوں)

میں نے اپنی سوچ کو انارکلی بازار سے واپس بلاتے ہوئے کہا ''میں جمد اجمد ا ہی رہ گیا، میرے کولوں تاں جمن دا موقع ای کھوہ لیا گیا، ہن پتہ نہیں فیر کدوں جمن دا موقع ملے۔''

(میں تو پیدا ہوتے ہوتے رہ گیا۔ مجھ سے تو پیدا ہونے کا موقع ہی چھین لیا گیا۔ اب پتہ نہیں دوبارہ کب پیدا ہونے کا موقع ملے۔

ستیش کے الفاظ تھے۔

ندیم کب پیچھے رہ جانے والا تھا، بولا

میری پیدائش لائل پور (فیصل آباد) کی تحصیل سمندری کے گاؤں رسیانہ کی ہے۔ میں آٹھ، برس کی عمر میں اپنے چچا کے پاس لاہور گیا تھا۔ اُس وقت زیادہ ہوش نہ تھی۔ ۱۹۹۴ء میں جب دِل کے معاملے (ہارٹ اٹیک) سے سرخرو ہو کر سرجیت (بیوی) کے ساتھ لاہور گیا تو صحیح معنوں میں تو مَیں اس وقت پیدا ہوا تھا۔

باتیں کرتے کرتے پتہ ہی نہ چلا کہ کب امرتسر ضلع کی حدود میں آ گئے۔ ڈرائیور کی تھکاوٹ کو دیکھتے ہوئے ستیش خود کار ڈرائیو کرنے لگا۔ امرتسر بائی پاس کے ذریعے ہم ۱۱ بجے کے قریب واہگہ بارڈر پہنچ گئے۔

یہاں موبائل فون نے کام کرنا بند کر دیا۔ کچھ دیر تک بارڈر کو اُداسی سے تکتے رہے۔ پھر کرنسی چینج کروائی۔ گھڑیوں کا وقت بھی بدل لیا۔ اردگرد چلنے والی گاڑیوں کے نمبر

بھی بدل گئے تھے۔مگر پنجاب کا ناک نقشہ وہی تھا۔ ازل سے سوہنا، سرسبز، صوفیوں اور گرووُں کی شانتی سے مخمور۔

کرنسی چینج کروائی تو انڈین ۱۰۰روپے کے پاکستانی ۱۳۵روپے ملے بتایا گیا کہ آگےاس سے بھی زیادہ مل سکتے ہیں۔ ہمارے گردقلیوں نے گھیراڈال لیا۔زیرو پوائنٹ تک سامان لے جانے کے انہوں نے ۵۰ روپے مانگے۔ ہم نے سوچا جائز ہی ہیں۔قلیوں کو سامان دے کرہم سٹیش اوراُس کے ڈرائیورکوالوداع کہہ کرگیٹ سے اندر چلے گئے۔آگے قلیوں کاٹھیکیدار کھڑا تھا۔اُس نے ہم سے پیسے وصول کر کے ۵۰ روپے کی رسید کاٹ دی۔ ہم نے سوچا کہ یہ تو بہت اچھا سسٹم ہے۔قلیوں کا اخلاق بھی بہت اچھا تھا۔ وہ ہمیں کسٹم آفیسرز کے پاس لے گئے۔ کسٹم اہلکار خندہ پیشانی سے ملے۔انہوں نے ہم سے مسکرا کر پاسپورٹ مانگے۔ پاسپورٹ لینے کے بعد ایک اہلکار نے ہم سے پاکستان آنے کا مقصد پوچھا۔ ہمارا جواب تھا۔ پاکستان کے گردواروں اور تاریخی مقامات کی یاترا۔اُس نے ہم سے اورکوئی سوال نہیں پوچھالیکن اُسی وقت ایک اورافسر وہاں آ پہنچا اورایک سکھ اہلکار سے بحث کرنے لگا۔ ''صبح کسٹم آفس کھلنے پر کمپیوٹر میں کوئی گڑ بڑ ہوگئی تھی اورآنے والا اہلکاراُس پرالزام لگا رہا تھا کہ اُس نے کمپیوٹر چلاتے وقت کوئی گڑ بڑ کی ہے۔دوسرااہلکاراُسے ذمہ دار قرار دے رہا تھا۔ پاسپورٹ چیک کرنے والا اہلکار الزام لگانے والے کی طرف داری کرنے لگا۔

ہمارے پاسپورٹوں کی طرف اُن کا دھیان ہی نہ تھا۔ پاکستان کی طرف جانے والے ہم دو ہی تھے یا ہم سے کچھ دور دو قلی کھڑے تھے،اور وہاں کوئی بھیڑ نہیں تھی تقریباً پانچ منٹ تک ہم اُن کی تو تو میں میں سنتے رہے۔آخر مجھ سے رہا نہ گیا۔

''بھائی صاحب! پہلے ہمارا۔۔۔'' میں نے ابھی اپنا جملہ پورا نہیں کیا تھا۔ظاہر ہے، میں کہنا چاہتا تھا کہ پہلے ہمارا کام کر دیں پھر بحث کرتے رہیں۔ندیم پر مارنے مجھے کھڑکی سے پیچھے ہٹالیا اور کہنے لگا'' ہمیں ایسی کیا جلدی ہے۔''

''ان کا تماشہ دیکھتے ہیں کہ یہ لوگ اپنی ذہنیت کا جلوس نکال رہے ہیں۔'' ایک کہہ رہا تھا اپنے ہاتھ سے کام کرنے کے بجائے دوسروں سے کام لیتے ہو۔ وہ کمپیوٹر کے متعلق کچھ جانتا ہی نہیں تھا تو اُسے کمپیوٹر پر بٹھایا ہی کیوں؟

دوسرا کہہ رہا تھا کہ رات کو جس نے کمپیوٹر بند کیے اُسی وقت کوئی گڑبڑ تھی۔ اُن چاروں میں سے کوئی بھی اپنی غلطی نہیں مان رہا تھا۔ پتہ نہیں اُس سکھ اہلکار نے مجھے کچھ کہتے یا ندیم کو مجھے کھڑکی سے پیچھے ہٹاتے اور کچھ کہتے دیکھ لیا تھا۔ وہ کہنے لگا'' کیوں خواہ مخواہ بحث کیے جاتے ہو۔ پہلے سردار صاحبان کو تو فارغ کرو۔''

ندیم کھڑکی کے ذرا اور قریب ہو گیا اور کہنے لگا۔

''ہماری خیر ہے آپ پہلے اپنا معاملہ تو نپٹا لیں۔''

وہ شاید ندیم کے الفاظ میں چھپے طنز کو سمجھ گئے، چاروں چپ کر گئے۔

کسٹم آفیسر نے پاسپورٹوں کو کمپیوٹر کے ذریعے چیک کر کے اُن پر مہریں لگائیں اور ہمیں منٹوں میں فارغ کر دیا۔ انہوں نے ہمارے پاسپورٹوں میں موجود،'' بھارت داخلے کے کارڈ'' اپنے پاس رکھ لیے۔

''جناب ہم دلی واپسی پر انہیں کیا دکھائیں گے۔'' ہم نے اہلکار سے پوچھا۔

''جب آپ واپسی پر یہاں آئیں گے تو آپ کو نئے کارڈ جاری کر دے جائیں گے۔'' اہلکار نے ہماری پریشانی دور کر دی۔

وہاں سے آگے بڑھے تو قلیوں نے ہمیں لیڈی کسٹم آفیسر کے سامنے جا پیش کیا۔ اُس نے بھی ہمارے پاسپورٹ چیک کیے اور کسٹم اہلکار کے پہلے دیے فارم پر ہمارے پاس موجود نقدی کا اندراج کیا۔ میں نے اپنے پاس موجود نقدی کا بتایا تو اُس اہلکار نے کہا کہ آپ دس ہزار سے زیادہ نقدی نہیں لے جا سکتے۔ اُس نے اُس میں دس ہزار کا ہی اندراج کیا تھا۔ وہ لڑکی ہمیں بڑے ہی احترام سے پیش آئی۔ اُس کا اخلاق دیکھ کر ہمارا دلی کے کسٹم اہلکاروں کے متعلق گلہ جاتا رہا۔

ہمیں بھارت والی سائیڈ پر ہی تقریباً ایک گھنٹہ لگ گیا۔قلیوں نے ہمیں بھارت پاک کے زیرو پوائنٹ پر پہنچا دیا اور دو دو سو روپے کی ٹپ کے لیے ترلے کرنے لگے۔آخر ہم نے سو سو روپے دے کر جان چھڑوائی۔

زیرو لائن سے پاکستانی قلیوں نے ہمارا سامان اُچک لیا۔اس طرف کے ٹھیکیدر را نے ۴۰، ۴۰ روپے کی رسیدیں کاٹ دیں۔میں نے اُسے انڈین کرنسی دی تو اُس نے انڈین روپے رکھ کر پاکستانی کرنسی میں رقم واپس کر دی۔

میں نے اُسے کہا کہ متبادل کرنسی کے حساب سے اور زیادہ روپے واپس ملنے چاہئیں مگر اُس نے کہا کہ پھر آپ پاکستانی کرنسی دے دیتے، میں نے فوراً اپنی پینٹ کی اگلی جیب میں ہاتھ ڈالنا چاہا تو وہ بولا سردار صاحب پانچ سات روپے کی خاطر کیوں اتنا ''چھوٹا کاتتے ہو'' سردار تو کھلے دل کے مالک ہوتے ہیں۔

ہم وہی روپے پکڑے آگے بڑھ گئے۔مجھے لگا کہ آگے یہ قلی بھی انڈین قلیوں کی طرح ٹپ کے لیے ضد کریں گے۔

پاکستانی بارڈر پر دو پولیس اہلکار پاسپورٹوں کی انٹری کر رہے تھے۔انہوں نے ہمیں ست سری اکال کہہ کر پاکستان کی دھرتی پر خوش آمدید کہا، انہوں نے اپنے رجسٹر میں ہمارے پاسپورٹوں کا اندراج کیا اور پاکستان میں رہنے کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کر کے رُخصت کیا۔

ہم گیٹ سے تقریباً دس قدم آگے بڑھے تھے کہ ہمارا ایک سکھ شخص نے اِستقبال کیا اُس کے ساتھ تین اور پاکستانی سواگت کیمرے لیے کھڑے تھے۔سکھ شخص نے اپنا تعارف راوی ٹی وی چینل کے پروڈیوسر گرجیت سنگھ کے طور پر کروایا اور مجھ سے پوچھنے لگا ''سردار صاحب کیا آپ پنجابی کانفرنس میں شرکت کے لیے آئے ہیں۔''

''آئے تو کانفرنس میں شرکت کے لیے ہی تھے مگر وہ کانفرنس تو ملتوی ہو گئی ہے۔ اب تو پاکستان کی سیر کے لیے آئے ہیں۔'' میں نے کہا ''کون کہتا ہے کہ کانفرنس ملتوی ہو گئی

ہے، اب تو آپ کے ایک منسٹر ایس، ترلوچن سنگھ کانفرنس میں شرکت کے لیے آ گئے ہیں۔ فخر زمان صاحب خود اُن کے استقبال کے لیے آئے تھے۔تھوڑی دیر قبل ہی گئے ہیں۔‘‘

کانفرنس ملتوی نہ ہونے کا سن کر ہماری خوشی دوچند ہوگئی۔ انہوں نے ہم سے درخواست کی کہ اگر ہم راوی چینل کے لیے اپنے تاثرات ریکارڈ کروانا چاہیں تو وہ حاضر ہیں۔ہم نے فوراًہاں کر دی۔

پہلے انہوں نے میراانٹرویو کیا۔گرمیت سنگھ کا پہلا سوال تھا۔

’’آپ انڈین پنجاب کے کس علاقے سے آئے ہیں۔‘‘

’’ہم دونوں کینیڈا کے شہر وینکوور سے عالمی پنجابی کانفرنس میں شرکت کے لیے آئے ہیں۔‘‘

کینیڈ یں ڈیلی گیٹس کے انٹرویو کرنے کا جان کر راوی چینل کو اور بھی خوشی ہوئی۔ کچھ رسمی باتوں کے بعد گرمیت نے مجھ سے میری تصانیف، کینیڈا میں پنجابی زبان کی حالت اور وہاں پنجابی کے لیے کیے جارہے اقدامات کے متعلق بہت سے سو گاؤں تحصیل سمندری میں واقع ہیں
قلی کچھ بے چینی سی محسوس کر
آ گے بڑھ گئے۔ راوی چینل پر یہ انٹرو ی
دوران بھی اس کی جھلکیاں دکھائی جاتی ر

قلیوں نے ہمارا سامان کسٹم اہلکاروں کے پاس جا کر رکھ دیا۔ اُن کا اخلاق بہت اچھا تھا۔ انہوں نے بغیر کسی سوال جواب کے پاسپورٹوں پر مہریں لگا دیں اور اس کے بعد ہم سے رسمی گفتگو کرنے لگے اس کے بعد ہمیں کرنسی تبادلے والا آدمی ملا۔ اُس نے ہمیں ۱۰۰ کے ۱۴۰ روپے دیے۔ یہاں پر ہم دونوں نے ۱۰۰۰ کی کرنسی بدلوالی۔ ۵۰۰ والے نوٹ کافی خستہ حالت کے تھے۔ کرنسی کی حالتِ زار انڈین کرنسی والی ہی تھی۔

ہم سمجھے کہ ہم اب فراغت پا گئے ہیں مگر ابھی ایک اور پڑاؤ باقی تھا۔ یہاں پر ہمارے سامان کی چیکنگ ہونا تھی۔ قلیوں نے ہمارا سامان کاونٹر پر رکھ دیا اور ہمارے لیے کرسیاں اُٹھا لائے۔ انہیں پہلے ہی پتہ تھا کہ یہاں دیر لگے گی۔ ہم کرسیوں پر بیٹھے۔ چیکنگ والے اہلکار کے منتظر تھے مگر فارغ ہونے کے باوجود کوئی بھی اہلکار وہاں نہیں آ رہا تھا۔ پندرہ بیس منٹ بعد ایک آدمی آیا۔ جب سے ہم پاکستان کی دھرتی پر پہنچے تھے قلیوں سے لے کر اعلیٰ افسران تک سب کا لباس ایک تھا۔ شلوار قمیص، عام اہلکار اور اعلیٰ افسر کے فرق کا پتہ ہی نہیں چلتا تھا۔ جب وہ آدمی ہمارے پاس آ کر کھڑا ہو گیا تو ہمیں پتہ نہیں چل سکا کہ وہ ہمارے سامان کی چیکنگ کرنے آیا ہے۔ اُس نے ہمارے ساتھ مصافحہ کیا اور پوچھا کہ ان اٹیچی کیسوں میں کیا لے کر جا رہے ہو۔ ہمارا جواب تھا کہ پہننے والے کپڑوں اور کتابوں کے علاوہ ہمارے پاس اور کچھ نہیں۔ اُس کا اگلا سوال تھا۔

''شراب تو نہیں لے کر جا رہے۔''

''نہیں۔'' ندیم نے کہا۔

اُس نے دوبارہ پوچھا ''اگر لے کر جا رہے ہیں تو بتا دیں میں رکھوں گا نہیں۔''

اُس کے دوبارہ پوچھنے پر میں نے چابیاں اُس کے سامنے کرتے ہوئے کہا ''ویسے تو آپ کو اعتبار نہیں آئے گا۔ اٹیچی کھول کر سامان چیک کر لیں۔''

ندیم دُکھی آواز میں کہنے لگا ''ہم اس عمر میں جھوٹ تو نہیں بولیں گے۔''

اُس آدمی نے چابیاں واپس کرتے ہوئے کہا۔

’’معاف کرنا، یہ ہماری ڈیوٹی کا حصہ ہے۔لوگ بتاتے کچھ اور ہیں اور اُن کے پاس ہوتا کچھ اور ہے۔

’’آپ اپنی ڈیوٹی پوری کریں۔ہمیں کوئی شکوہ نہیں۔‘‘ ندیم نے کہا۔

مہربانی خوش آمدید کہہ کر اُس نے ہمارے ساتھ مصافحہ کیا اور ہم گیٹ سے باہر آ گئے۔

باہر چھاؤں میں ہمارا سامان رکھتے ہوئے ایک قلی کہنے لگا۔

’’کانفرنس کے لیے آنے والوں کو لینے کے لیے گاڑیاں آئی ہوئی تھیں۔ یہ ایک گاڑی کھڑی ہے میں پوچھ کر آتا ہوں۔ اُس وقت ڈھلتی دوپہر کی گرمی تھی اور پسینہ آ رہا تھا۔ باہر دو عام سی چائے کی دکانیں تھیں۔ وہاں زیادہ رونق بھی نہ تھی۔ میں اُس کوچ کی طرف دیکھ رہا تھا جو کانفرنس کے مہمانوں کے لیے کھڑی تھی۔قلی کے ساتھ ایک آدمی کوچ سے باہر نکلا اُس نے ہم سے مصافحہ کرتے ہوئے تعارف کروایا،’’میرا نام کنول مشتاق ہے ہم تو واپسی کے لیے تیار تھے کہ اب کوئی نہیں آئے گا۔ اچھا ہوا آپ عین وقت پر آ گئے۔ ورنہ آپ کو خاصی زحمت اُٹھانا پڑتی۔‘‘

ہم نے بھی اپنا تعارف کروایا تو پتہ چلا کہ وہ ندیم پرمار کے نام سے واقف ہے ہمارا سامان قلیوں نے کوچ میں رکھ دیا۔ انڈین قلیوں کی طرح وہ بھی زیادہ ٹپ کے لیے اڑ گئے۔انہیں بھی سو سو روپے دیے اور کوچ میں بیٹھ کر لاہور کی طرف روانہ ہوئے۔

کنول مشتاق مغربی پنجاب کا جانا مانا شاعر ہے۔عالمی پنجابی کانفرنس کا سیکریٹری اور مشاعرہ کمیٹی کا صدر۔’’اور سورج مکھی‘‘ تنظیم کا چیئرمین۔

اسے ہم نے بتایا کہ انڈیا میں تو سب اخباروں نے کانفرنس ملتوی ہو جانے کی موٹی سرخیاں لگا دی ہیں۔ ویزے ہی نہیں ملے، سورائٹر اور فنکار کیسے آ سکتے تھے۔ اُسے انڈیا سے زیادہ ڈیلیگیسٹ نہ آنے کا افسوس تھا مگر اُس نے بتایا کہ ایس ترلوچن سنگھ کے ساتھ کئی ڈیلیگیسٹ آ گئے ہیں کچھ ڈیلیگیسٹ دلی سے بھی آ گئے ہیں۔ اس لیے انڈیا کی نمائندگی ہو گئی

ہے۔ کچھ لوگوں کے کل تک آ جانے کی توقع ہے۔

اس کے بعد غیر ممالک میں لکھے جا رہے پنجابی ادب کے متعلق بات چل نکلی کنول مشتاق کو بھارتی پنجاب کے بہت سے لکھاریوں سے تو واقفیت تھی مگر دوسرے ممالک میں رہ رہے پنجابی لکھاریوں کے متعلق جانکاری بہت کم تھی۔ میرا دھیان باتوں کے بجائے بیرونی ماحول کی طرف زیادہ تھا۔اس مغربی پنجاب کا منظر مشرقی پنجاب سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھا۔ایک ہی جیسے کھیت اور گندم کی پکی فصل ،مشرقی پنجاب سے میل کھاتی تھی۔

ہماری کوچ نہر سے ہوتی ہوئی لاہور برانچ کے راستے پر ہولی۔کوچ کا ڈرائیور یار محمد بھی ہنس مکھ طبیعت والا تھا۔وہ کوچ ڈرائیو کرتے ہوئے ساتھ ساتھ کوئی نہ کوئی بات کر کے ماحول کو رنگین بنا دیتا تھا۔ میں باتوں میں ہنگارا، نہ ہونے کے برابر دے رہا تھا۔ مجھے تو اِرد گرد کے ماحول کو جاننے کی خواہش تھی۔لاہور برانچ کے دونوں طرف سڑکیں بنی ہوئی تھیں۔اب ہم لاہور کے مضافات میں پہنچ چکے تھے۔نہر کے دونوں طرف سڑک کے ساتھ ساتھ پھول دار اور سایہ دار درخت لگے ہوئے تھے۔جیسے جیسے ہم شہر کے اندر جا رہے تھے بھیڑ میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ماروتی کاروں کی طرح ہی کی سوزوکی کاریں نظر آ رہی تھیں۔ لدھیانے کے آٹو رکشاؤں کی طرح یہاں بھی آٹو رکشاؤں کی بھرمار ہے۔ایسے لگتا ہے جیسے آمدورفت کا بڑا ذریعہ آٹو رکشہ ہی ہو یہاں کے زیادہ تر آٹو رکشاؤں کی بناوٹ لدھیانے اور امرتسر کے آٹو رکشاؤں سے الگ ہے۔ان کی بناوٹ تانگوں کی سی ہے۔تین سواریاں آگے کو منہ کر کے بیٹھتی ہیں اور تین سواریاں پیچھے کو۔اُوپر چھت ہے عام طور پر مرد اگلے حصے میں بیٹھے نظر آتے ہیں اور عورتیں پیچھے۔کوئی کوئی عورت ہی برقعے میں نظر آ رہی تھی مگر تقریباً تمام عورتوں کے سر ڈھکے ہوئے تھے۔کہیں کہیں کوئی تانگہ بھی سواریاں لے کر جا رہا تھا۔

یار محمد نے کوچ نہر سے اُتار کر لنک روڈ پر ڈال لی ہے۔ہم نے شالا مار باغ کراس کر لیا ہے اور کوچ اب جی۔ٹی روڈ پر دوڑ رہی ہے۔کوچ ریلوے اسٹیشن سے ہوتی ہوئی بوھڑ

والے چوک میں آ گئی ہے۔ کنول مشتاق نے بتایا کہ یہاں پہلے بہت بڑا بوھڑ (برگد) ہوتا تھا جو سارے چوک پر چھایا ہوتا تھا۔ پتہ چلا کہ پاکستان کی سابق وزیراعظم محترمہ بے نظیر بھٹو کے شوہر آصف علی زرداری لاہور آ رہے تھے۔ اُن کے پنجابی کانفرنس میں شرکت کرنے کی بھی خبر تھی مگر پنجاب کی سرکار نے انہیں نظر بند کرلیا۔ اُن کی نظر بندی پر لوگ سڑکوں پر نکل آئے تھے۔ پتہ چلا کہ سرکار نے اعلان کر دیا ہے کہ زرداری صاحب کو گرفتار نہیں کیا گیا بلکہ اُن کی حفاظت کے لیے ہی انہیں نظر بند کیا گیا ہے۔ جلد ہی اُنہیں رہا کر دیا جائے گا۔ وہ جہاں چاہیں جا سکتے ہیں اُن پر کوئی پابندی نہیں۔

یار محمد نے کوچ موڑ کر دوسری سڑک پر ڈال دی اور ریلوے ہیڈکوارٹر سے آگے لے جا کر شملہ پہاڑی نامی مشہور پارک کے پاس گھما کر ہوٹل ایمبیسیڈر کے پارک میں کھڑی کر دی۔ یہاں پر باہر سے آئے ہوئے لکھاریوں کی رہائش کا بندوبست تھا۔ ہمارا سامان ہوٹل کے ملازموں نے اُتار کر ہوٹل کے لاونج میں رکھ دیا۔ ہم کاونٹر پر ریسپشنٹ کے پاس جا کھڑے ہوئے۔ اُس نے خوش آمدید کہا اور ہمارے پاسپورٹ فوٹو کاپی کے لیے رکھ کر ہمیں کمرہ نمبر۱۰۲، کی چابی پکڑا دی، ہمارا سامان کمرے میں پہنچا دیا گیا اور ہم شام کے پروگرام کے انتظار میں اپنے اپنے بیڈ پر لیٹ گئے۔



مِتّر ملنیاں

ہمیں اپنے کمرے میں لیٹے تقریباً ایک گھنٹہ ہوا ہوگا۔ نیند آنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ ہم لیٹے لیٹے بھارتی پنجاب سے نہ آسکنے والے وفود پر تبصرہ کرر ہے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے اُٹھ کر دروازہ کھولا۔ سامنے شلوار قمیص میں ملبوس جناب فخر زمان اپنے ایک ساتھی سمیت کھڑے تھے۔ وہ گرم جوشی سے گلے ملے اور پہلا سوال یہ کیا
''درشن نہیں آیا۔''

ڈاکٹر درشن گل عالمی پنجابی کانگرنس کینیڈا یونٹ کے سربراہ ہیں، ندیم پرمار نے اُن کے نہ آنے کی وجہ اور مجبوری بتاتے ہوئے اُن کی طرف سے معذرت کی۔ انہوں نے کانفرنس کے لیے آنے پر ہمارا شکریہ ادا کیا اور شام کے کھانے پر دوبارہ ملنے کا وعدہ کر کے واپس چلے گئے۔ وہ اس ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے سب لوگوں سے ملے اور انہیں خوش آمدید کہا۔ انہیں ایک تو یہ علم ہوگیا کہ کون کون اور کہاں کہاں سے پہنچ چکے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی پتہ چل گیا کہ ڈیلی گیٹ کے بھیس میں کوئی غیر متعلقہ آدمی آ کر ہوٹل میں ٹھہر تو نہیں گیا۔ انہوں نے جیسے ہر ایک کے نام یاد کرر کھے تھے۔ ہر ایک کو اس کا نام لے کر بلا رہے

تھے۔اس سے ہر شخص اُن سے قربت اور اپنائیت محسوس کر رہا تھا۔ہم جناب فخر زمان کی مہمان نوازی کی باتیں ہی کر رہے تھے کہ کنول مشتاق ہمارے لیے ڈیلی گیٹ کٹس لے کر آ گیا۔اس میں ایک بڑا خوبصورت کالا ہینڈ بیگ تھا جس میں ایک خوبصورت ڈیلی گیٹ بیج تھا جو کہ کانفرنس کے مختلف سیشنوں میں اپنی گردن میں لٹکانے کے لیے تھا تا کہ ہر کوئی آپ کے متعلق پوچھے بغیر ہی جان سکے۔ بیگ میں ایک نوٹ بک اور پین کانفرنس کی کاروائی لکھنے سے متعلق تھا۔ایک سوونیر تھا جس میں ماضی میں ہو چکی کانفرنسوں کی رپورٹ تھی۔ بیگ کے اوپر سفید رنگ کے انگریزی حروف میں بارہویں عالمی پنجابی کانفرنس لاہور لکھا ہوا تھا۔ یہ ایک طرح سے ڈیلی گیٹس کے لیے منتظمین کی طرف سے تحفہ تھا۔

کنول مشتاق اور اُس کا ساتھی جو کہ اُس کے ساتھ ہی آ گیا تھا، ہمارے ساتھ کانفرنس کی کامیابی کے متعلق گفتگو کرتے رہے۔انہوں نے بتایا کہ بھارتی ڈیلی گیٹس کے لیے منتظمین نے مختلف ہوٹلوں میں (80) اسّی کمرے بک کروا رکھے ہیں، جس کا تمام خرچ اب منتظمین کو مفت میں اُٹھانا پڑ رہا ہے۔(کیوں کہ بھارتی ڈیلی گیٹ نہیں آ سکے تھے) جاتے وقت وہ ہمیں بتا گئے کہ شام کا استقبالیہ پروگرام اور کھانا فوڈ سٹریٹ میں ہوگا۔کنول نے کہا کہ 7 بجے تیار ہو کر لاونج میں آ جائیں۔وہاں سے ڈیلی گیٹس کو کوچ میں ہی فوڈ سٹریٹ لے جائیں گے۔

ہم سات بجے تیار تھے اور استقبالیہ پروگرام کے لیے لاونج میں موجود تھے۔ یہاں صوفوں پر براجمان نئے ساتھیوں سے ملاقاتیں ہوئیں اور دوستی کے رستے کھلے۔ نئے ملاقاتیوں میں انگلینڈ سے بلبیر کنول اور سنتوکھ سنگھ سنتوکھ تھے۔کراچی سے بابا نجمی اور نیویارک سے سنتوکھ سنگھ۔ابھی ایک دوسرے سے جان پہچان کا سلسلہ چلا ہی تھا کہ کوچ میں بیٹھنے کا پیغام آ گیا۔

کوچ ہوٹل کے کار پارک سے باہر آئی تو تھوڑا تھوڑا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ پولیس کی پائیلٹ گاڑی کوچ کی راہنمائی کر رہی تھی۔ پولیس اسکاوٹ کی جلتی بجھتی بتیاں سڑکوں

سے ٹریفک کو ایک طرف کرتے ہوئے کوچ کو راستہ دینے کے لیے اشارہ کرتے آگے جارہی تھیں۔بجلی کی بتیوں کی روشنی میں لاہور شہر جگمگ جگمگ کرر ہا تھا۔ہمیں کوچ میں بیٹھے پتہ نہیں لگ رہا تھا کہ ہم کس طرف کو جارہے ہیں۔یہ ڈیلکس کوچ اور کوچ ڈرائیور وہی تھا جو ہمیں واہگہ بارڈر سے لے کر آیا تھا۔یار محمد خاں!

کوچ کو نسبت روڈ کے کونے پر روک لیا گیا۔پولیس والوں نے کوچ کے ٹھہرنے کے لیے جگہ بنوائی۔وہاں چوک میں لوگوں کا بے پناہ رش تھا۔سکوٹروں،موٹر سائیکلوں اور کاروں کا جھمگھٹا تھا۔کہیں پیر دھرنے کو بھی جگہ نہ تھی۔گوالمنڈی کی فوڈ سٹریٹ میں باہر گلی میں ہی کھانے کا انتظام کیا گیا تھا۔ہمیں جلوس کی شکل میں کھانے کے میزوں کی طرف لے جایا جارہا تھا۔بھارت کے منارٹی کمیشن کے چیئرمین ایس ترلوچن سنگھ مہمان خصوصی تھے۔وہی تمام میڈیا اور عام پبلک کی نگاہوں کا مرکز تھے۔کیمروں کا فوکس بھی مہمان خصوصی کی جانب ہی تھا۔جلوس آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔کیمرے والے کا دھیان ہماری طرف ہوا تو اُس نے منتظمین کی توجہ ہماری جانب مبذول کروائی۔دو منتظمین مجھے اور ندیم کو بھیڑ میں سے نکال کر آگے ایس ترلوچن کے پاس لے آئے۔یہاں ڈیلی گیٹس کا گلاب کے پھولوں سے بنے ہار پہنا کر استقبال کیا جارہا تھا۔گلاب کے پھولوں کی مہک روح کو معطر کررہی تھی ہمیں بھی ہار پہنائے گئے اور تصویریں لی گئیں۔ندیم پرمار کے ایک دوست نے اپنا ہار اُتار کر اُس کے گلے میں پہنا دیا۔واقف اور ناواقف سب ایک دوسرے کے گلے مل رہے تھے۔آہستہ آہستہ آگے سرکتے ہوئے جب کھانے کی میزوں کے پاس گئے تو ہم دونوں کو ایس ترلوچن سنگھ کی کرسی کے ساتھ والی کرسیوں پر بٹھا دیا گیا۔جو لوگ وہاں کرسیوں پر قابض تھے سب کو وہاں سے اُٹھا دیا گیا۔وہاں بیٹھے لوگوں کو بتایا گیا کہ یہ کرسیاں خاص مہمانوں کے لیے ہیں۔اس کرسیوں کی قطار کو چھوڑ کر باقی مہمان سرخ کرسیاں لگی ہیں وہاں اپنی مرضی سے بیٹھ جاؤ۔کسی نے بھی اُٹھنے میں عذر نہیں کیا۔سب کرسیاں چھوڑ کر دوسری کرسیوں پر جا بیٹھے۔

ایس، ترلوچن سنگھ کے ساتھ بیٹھے ندیم پرمار نے اُن سے اپنے پھگواڑے والے چچا گربچن سنگھ پرمار کا ذکر کیا تو وہ دوبارہ ہمیں گلے ملے اب باتوں کے لیے ایک اور موضوع ہاتھ آ گیا تھا۔ وہیں بیٹھے بیٹھے ایس پریم سنگھ برمنگھم انگلینڈ والوں سے ملاقات ہوگئی۔ اُن سے جان پہچان بڑھی، انہوں نے ہماری تصویریں لیں اور مووی کیمرے سے ہماری مووی بنائی۔

پاکستان کے نامور گلوکار شوکت علی ہمارے ساتھ والی کرسی پر آ بیٹھے۔ کچھ دیر قبل ہی ہماری جان پہچان ہوئی تھی۔

بابا نجمی جو کہ شام کے وقت ہمارے ساتھ ہی یہاں آیا تھا وہ بھی ہمارے نزدیک ہی کرسی پر آ بیٹھا۔ منتظمین ڈیلی گیٹس کو دور کی کرسیوں سے نزدیکی کرسیوں پر بلا رہے تھے۔ ٹی۔ وی والے پھر ہماری طرف آ گئے۔ انہوں نے امن اور دوستی کے متعلق ہمارے ساتھ تبادلہ خیال کیا اور امن اور دوستی کے متعلق ایک ایک شعر بولنے کے لیے درخواست کی۔ ندیم پرمار نے یہ شعر کہا:

ایہہ قدرت دی کرو پی ہے یا ہے فتنہ زمانے دا
میں اپنے گھر نوں جد آیاں تاں آیاں اجنبی بن کے

(یہ تقدیر کا کھیل ہے یا زمانے کا فتنہ ہے کہ میں جب بھی اپنے گھر کی طرف آیا تو اجنبی بن کر ہی آیا)

اُس کے بعد بابا نجمی نے یہ شعر سنایا:

مسجد میری توں کیوں ڈھاویں میں کیوں توڑاں مندر نوں
آ جاو دوویں بہہ کے پڑھیئے اک دوجے دے اندر نوں

صدیاں وانگوں اج وی کجھ نہیں جانا مسجد مندر دا
لہو تے تیرا میرا لگدائے تیرے میرے خنجر نوں

پریس فوٹو گرافرز نے بابا نجمی، شوکت علی اور ہماری تصویریں لیں۔ پریس غیر ملکی ڈیلی گیٹس کی جانب زیادہ توجہ دے رہے تھے۔ انہوں نے انگلینڈ سے آئے وفد کے ساتھ بھی ہماری تصویریں لیں۔ وہ غیر ملکی ڈیلی گیٹس کو تلاش کر کر کے اُن کے تاثرات ریکارڈ کر رہے تھے۔ گفتگو کا موضوع امن اور دوستی تھا۔

پریس والوں سے فارغ ہوئے تو شوکت علی سے ٹی۔ وی والوں نے کچھ سنانے کی درخواست کی۔ انہوں نے خود تو کچھ نہ گایا البتہ اپنے شاگرد سے کچھ سنانے کو کہا اُس نے ''وسدے رہو گواہنڈیو'' (آباد رہو پڑوسیو) بغیر کسی ساز کے گایا تو محفل میں وجد طاری ہو گیا۔ وہ گا چکا تو میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھے شخص نے داد دیتے ہوئے کہا ''لڑکے نے فوک کو کیا کمال کے کلاسیکل سُروں میں گایا ہے۔''

رات دِن میں غائب ہو رہی تھی۔ فوڈ سٹریٹ اور گوالمنڈی میں ابھی تک میلے کا سماں تھا۔ کھانا لگا دیا گیا تھا۔ کھانے میں کئی طرح کا گوشت تھا جیسے سیخ کباب، میٹ کڑاھی، روسٹ مرغا، کڑھائی، مچھلی، روسٹ مچھلی، بکرے کا گوشت وغیرہ۔ سپیشل ساگ اور مکئی کی روٹی کا بھی اہتمام تھا۔ اس کے ساتھ اور بھی کئی قسم کے کھانے تھے۔ پینے کے لیے کوک اور نیسلے کی پانی کی بوتلیں رکھی ہوئی تھیں۔

ایک شخص نے نیسلے پانی کی بوتل ہمارے سامنے لا کر رکھ دی اور کہنے لگا ''یہ پانی آپ کے لیے ہے۔'' پانی کی بوتل آدھی بھری ہوئی تھی۔ میں نے پانی گلاس میں ڈال کر پیا تو اپنی ڈھڑ دھڑی کو بڑی مشکل سے روک سکا۔ بچا پانی ندیم پر مار کے آگے کرتے ہوئے کہا۔

''یہ پانی پی کر دیکھو۔''

ندیم نے پانی کا گلاس خالی کر کے دھڑ دھڑی لی، پھر مونچھیں سنوارتے ہوئے آہستہ سے بولا۔

''اوئے یہ پانی، اگر یہ پانی پلانا ہی تھا تو پہلے کہاں تھے۔''

جو شخص ہمیں پانی کی بوتل دے کر گیا تھا اُس نے ہم سے پوچھے بغیر ہی اس گلاس میں اور پانی ڈال کر پوچھا۔

''میں یہ پانی والی بوتل لے جاؤں؟''

میں نے اُس شخص کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہمیں اور پانی کی بالکل بھی ضرورت نہیں۔ آپ بے شک یہ گلاس والا پانی بھی لے جائیں۔''

''نہیں جناب، یہ پانی تو آپ کو پینا ہی پڑے گا۔'' یہ کہہ کر وہ پانی کی بوتل لے کر آگے چلا گیا۔ ہمارے ساتھ بیٹھے شوکت علی ہماری طرف دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔

اُس آدمی کے جانے کے بعد میں نے آہستہ سے اُس گلاس کو ایک طرف کھسکا دیا تاکہ اُس میں سے کوئی اور شخص گھونٹ نہ بھرے۔ وہاں میں نے دیکھا کہ جھوٹے برتن کی کوئی تمیز نہ تھی۔ سب ایک ہی گلاس میں پانی پی لیتے تھے اور ایک ہی برتن میں سب کھا لیتے تھے۔

میں نے آہستہ سے ندیم کے قریب جاتے ہوئے پوچھا۔

''یہ تمہارے ناول والا اِندر جل تو یہاں نہیں آ گیا۔''

ندیم کہنے لگا ''اُس اِندر جل کو چھوڑو یہ سوراجل پی کر کھانا کھاتے ہیں۔ ہم نے ہنستے ہنستے کھانا کھایا۔ شوکت علی صاحب پوچھ رہے تھے'' کیوں کھانے کا سواد کیسا ہے۔''

اس بھری محفل میں سے اُٹھنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا مگر کنول مشتاق کوچ میں بیٹھنے کے لیے بار بار آوازیں دے رہا تھا۔ شوکت علی اور اُس کے ساتھیوں کو الوداع کہہ کر کوچ میں آ بیٹھے۔ ندیم پرمار کے گلے میں پھولوں کے دو ہار تھے۔ اُس نے ایک ہار اُتار کر ڈرائیور کے گلے میں ڈال دیا۔ ڈرائیور یار محمد خاں یہ اعزاز پا کر بہت خوش ہوا۔ کوچ ابھی سٹارٹ نہیں ہوئی تھی کچھ سواریاں باقی تھی۔ کنول مشتاق انہیں لانے کے لیے واپس مڑ گیا۔ اتنی دیر میں افضل میاں جو لاہور ریڈیو پر پروگرام کرتا ہے اور پنجابی کا نامور شاعر بھی ہے کوچ

میں آ کے بیٹھ گیا۔ وہ ہمارے پاس ہی آ کر بیٹھ گیا اور جان پہچان کا تبادلہ کیا۔ اُس نے اپنی واقفیت کرواتے ہوئے بتایا کہ وہ کئی مرتبہ بھارت کا چکر لگا چکا ہے اور امرتا پریتم کو بھی مل چکا ہے۔ مشرقی پنجاب کے بہت سے لکھاریوں سے اُس کی جان پہچان ہے۔ اُسے گرمکھی پڑھنی لکھنی آتی ہے اور وہ اجیت، نواں زمانہ اور دیش سیوک میں چھپتا ہے۔ افضل میاں باتوں کا دھنی تھا۔ کوچ میں بیٹھنے کے دوران اُس نے کسی اور کو بولنے کا موقع کم ہی دیا۔ باتوں کے دوران پتہ چلا کہ وہ ندیم کی جنم دھرتی کے قریب ہی کا رہنے والا ہے۔ کسی بات کے دوران اُس نے اپنے بائیں ہاتھ کی کٹی ہوئی انگلی دکھائی تو ندیم نے اپنے دائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی کے ساتھ والی کٹی ہوئی اُنگلی دکھا دی۔ اُن کی کٹی ہوئی اُنگلیاں دیکھ کر میں نے فوراً کہا تمہاری تو رشتہ داری بڑی پکی ہے۔ آپ اُنگلی کٹ سانڈھو ہو گئے ہیں یہ بات سن کر سب قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔

پولیس اسکارٹ آگے چل پڑی اور ہماری کوچ اُس کے پیچھے ایمبیسیڈر ہوٹل کی طرف روانہ ہوگئی۔ افضل ساحر نے مزاحیہ ٹپے بولیاں شروع کر دیے۔ ماحول ہنسی مذاق کا بنا رہا۔ کوچ ہوٹل کے کار پارک میں پہنچی تو افضل ساحر کل صبح کے لیے ہم سے ریڈیو ٹاک شو میں شرکت کا وعدہ لے کر رُخصت ہوا۔ جب ہم اپنے کمرے میں پہنچے تو ۱۷اپریل کو شروع ہوئے ایک گھنٹہ گزر چکا تھا۔



پنجابی کانفرنس کا آغاز

بارھویں عالمی پنجابی کانفرنس کو کامیاب بنانے اور صحیح انداز سے آگے بڑھانے کے لیے کئی کمیٹیوں کا قیام عمل میں لایا گیا تھا۔ جیسے کہ آرگنائزنگ کمیٹی، انفارمیشن اور پبلیسٹی کمیٹی، فلم اور ٹی وی کمیٹی اور ڈیکلرلشن کمیٹی وغیرہ۔ ہر کمیٹی کے لیے کچھ ممبر نامزد کیے گئے تھے۔ کانفرنس کا بندوبست چونکہ پاکستانی منتظمین نے کیا تھا اس لیے کسی بھی کمیٹی میں کسی غیر ملکی رائٹر کو شامل نہیں کیا گیا تھا۔ کمیٹیوں کے ممبر ویسے تو ۵۰،۶۰ کے قریب تھے لیکن تمام معاملات کی دیکھ بال کے لیے تقریباً ۱۵ لوگ ہی سرگرم تھے۔ کانفرنس کا انتظام ہر سطح پر خوش اسلوبی سے کیا گیا تھا۔

کانفرنس کے سیشن الحمرا کمپلیکس کے ہال نمبر ۲ میں ہونا تھے پہلے سیشن میں شرکت کے لیے شرکاء کو ساڑھے دس بجے الحمرا ہال نمبر ۲ میں پہنچے کے لیے کہہ دیا گیا تھا۔ میں اور ندیم بڑی مشکل سے تین گھنٹے ہی سوئے ہوں گے۔ پانچ بجے ہی آنکھ کھل گئی۔ ہم تیار بھی جلد ہی ہو گئے آٹھ بجے کے قریب ہوٹل کے ریسٹورنٹ میں ناشتے کے لیے نیچے آ گئے۔ وینکوور سے وہاں پہنچا ہوا ہمارا دوست ہردیو وڑائچ بھی ناشتے کی میز پر مل گیا۔ کینیڈا کے ہم تین

شرکاءہوگئے تھے۔ہمیں پتہ چلا کہ وینکوور اور ٹورنٹو سے اورشرکاءبھی آئے ہوئے ہیں۔بعد میں ہمیں پتہ چلا کہ اُن میں کوئی نامور لکھاری نہیں تھا۔اُن کا تعلق سماجی اور ثقافتی پروگراموں سے تھا۔اُن میں سے کئی ویسے ہی پاکستان کا چکر لگانے آئے تھے، کچھ آرٹ اور امن کے میدان میں کام کرنے کی وجہ سے کانفرنس میں شرکت کے لیے آ گئے تھے۔اس طرح مل جل کر کینیڈا سے ہمارا آٹھ شرکاءکا گروپ بن گیا تھا۔

الحمرا ہال جانے کے لیے ہم تقریباً دس بجے ہی کمرے سے نکل کر لاونج میں آ گئے۔وہاں کئی شرکاء پہلے ہی آئے بیٹھے تھے۔یہاں نئی دوستیاں بننے لگیں۔اس ہوٹل میں ٹھہرائے گئے زیادہ غیر ملکی شرکاء پنجابی لکھاری ہی تھے۔چنانچہ آپس میں اپنے اپنے ملکوں کی ادبی سرگرمیوں کی بات ہوتی رہی۔

ساڑھے دس بجےکوچ میں بیٹھ کر الحمرا کی طرف چل پڑے،اب بھی پولیس اسکارٹ کوچ آگے آگے تھا۔کنول مشتاق ہمارے ساتھ ہی تھا۔آگے الحمرا میں ''جی آیاں نوں'' کہنے کے لیے جناب فخر زمان اور جناب اعزاز احمد آذر حاضر تھے۔

الحمرا ہال کے سٹیج کو بہت ہی سندرتا سے سجایا گیا تھا۔سٹیج کو سجانے کی ذمے داری پاکستان کے نامور مصور جناب ایس۔ایم منصور کے کاندھوں پر تھی۔انہوں نے اس ذمہ داری کو اتنی خوبصورتی سے نبھایا تھا کہ آنکھیں سٹیج سے ہٹنے کا نام ہی نہ لیتی تھیں۔

اس کانفرنس میں اظہار خیال کے لیے چار موضوعات رکھے گئے تھے۔ادب، آرٹ،کلچر اور امن۔ان چاروں موضوعات کی عکاسی کرنے والے بینرز سٹیج پر آویزاں کیے گئے تھے۔سٹیج کے اگلے حصے کی کئی قسم کے تازہ پھولوں سے سجاوٹ کی گئی تھی۔ایسا لگ رہا تھا جیسے ان پھولوں سے کوئی عبارت لکھی گئی ہو۔پھولوں کے پیچھے سٹیج پر دو گدے دار کرسیاں رکھی گئی تھیں۔ایک کرسی سیشن کے صدر کے لیے اور دوسری کانفرنس کے چیئر مین جناب فخر زمان کے لیے۔ان کرسیوں کے دائیں بائیں پانچ پانچ کرسیاں صدارتی پینل (پردھانگی منڈل) کے لیے رکھی گئی تھیں۔سٹیج کی چھت اور پچھلے حصے کو کالے کپڑے سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔

۱۱ بجے تک سارا حال حاضرین اور شرکاء سے بھر گیا تھا۔ ہر شخص کے گلے میں لٹکتا بیج اُس کی شناخت واضح کرر ہا تھا۔

ساڑھے گیارہ بجے کے قریب جناب فخر زمان مہمان خصوصی کو ساتھ لے کر ہال میں داخل ہوئے تو ہال تالیوں سے گونج اُٹھا۔ کانفرنس کی کارروائی شروع ہوئی۔ عام کانفرنسیں جس دیس میں ہو رہی ہوں اُس دیس کے مذہبی یا قومی گیت سے شروع ہوتی ہیں مگر اس کانفرنس کی انفرادیت یہ تھی کہ یہ ایک ایسے گیت سے شروع ہوئی جو دونوں دیسوں کی سلامتی مانگتا ہوا عوام کے درمیان دوستی اور امن کا خواہاں تھا۔ یہ گیت جناب افضال شاہد کا لکھا ہوا تھا، جناب شوکت علی صاحب نے گایا تھا اور اس کی موسیقی جناب خلیل رانا نے ترتیب دی تھی۔ گیت کے بول تھے:

ایہہ پنجاب وی میرا اے تے اوہ پنجاب وی میرا اے
قائم رہن سرحداں شالا ساریاں کھولھ دیو
بوہے کھولھ دیو، ایہہ باریاں کھولھ دیو

گیت اتنا جذباتی تھا اور اتنے خوبصورت ڈھنگ سے گایا گیا تھا کہ ہر سامع کی آنکھ میں پانی تیر رہا تھا۔

گیت کے اختتام سے کچھ لمحات کے بعد جناب اعزاز احمد آذر کی آواز نے سامعین کو متوجہ کیا۔ وہ آج کے صدارتی پینل کے متعلق بتا رہے تھے۔ وہ پہلے صدارتی پینل میں شامل مہمان کا تعارف کرواتے اور پھر مخصوص نشت پر تشریف لانے کے لیے درخواست کرتے۔ سب سے پہلے انھوں نے پاکستان کے سابق صدر جناب رفیق تارڑ کا تعارف کرواتے ہوئے انھیں صدارتی منصب سنبھالنے کی درخواست کی۔ یہ سیشن اُن کی زیر صدارت ہو رہا تھا۔ اس کے بعد ہندوستانی مینارٹی کمیشن کے چیئر مین اور آج کے سیشن کے مہمان خصوصی جناب ایس ترلوچن سنگھ کو سٹیج پر بلایا گیا۔ غیر ملکی لکھاریوں میں سے بھی چند ایک کو سٹیج پر نمائندگی دی گئی۔ اس سیشن میں کینیڈا سے ندیم پرمار انگلینڈ سے سنتوکھ سنگھ سنتوکھ،

ہالینڈ سے اسد مفتی اور چرن جنڈیالوی نمائندگی کر رہے تھے۔اس کے علاوہ پاکستان کی کئی نامور شخصیات جیسے جناب افضل احسن رندھاوا،عبدالغفور قریشی (جو کہ گیانی عبدالغفور قریشی کے نام سے بھی جانے جاتے ہیں اور'' پنجابی ادب دی کہانی'' کے مصنف ہیں) قاسم بوگیو اور منشا یاد۔

استقبالیہ خطاب جناب فخر زمان کا تھا۔انہوں نے دونوں حکومتوں (پاک، ہند) سے امن اور دوستی کی اپیل کرتے ہوئے مطالبہ کیا کہ دونوں دیسوں کے سیاحوں کے لیے ویزے کی چھوٹ دی جائے۔بسیں چلائی جائیں تمام بارڈر کھول دیے جائیں پاکستانی پنجاب میں پنجابی زبان کو پہلی جماعت سے یونیورسٹی تک ذریعہ تعلیم بنایا جائے۔لاہور میں پرائیویٹ سیکٹر میں ایک پنجابی یونیورسٹی قائم کرنے کی اجازت دی جائے۔

جناب فخر زمان نے پہلی کانفرنسوں کے انعقاد میں پیش آنے والی رکاوٹوں کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ ایک وقت وہ بھی تھا کہ جب دونوں دیسوں کے رائٹرز آپس میں ملتے تھے تو اُن پرسی۔آئی۔ڈی کے آدمی ہونے یا غدار ہونے کا ٹھپہ لگا دیا جاتا تھا۔آج اس کانفرنس کی حاضری بتا رہی ہے کہ اب وہ بات نہیں رہی۔انہوں نے اس کامیابی کا سہرا پنجابی پیاروں کے پکے عزم اور امن اور دوستی کے لیے اُن کی کمٹمنٹ کو قرار دیا۔

جناب فخر زمان کے خطاب کے بعد سٹیج پر موجود تمام مہمانوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا جن کا مرکزی خیال یہ تھا کہ ان کانفرنسوں کی بدولت ہی پاکستانی پنجاب میں پنجابی زبان کی بات ہونے لگی ہے اور کچھ کچھ اس کی سنی بھی جانے لگی ہے۔ان کانفرنسوں کی بدولت ہی دونوں دیسوں کے ادیب ایک دوسرے کے قریب آ رہے ہیں اور دونوں پنجابوں کے کلچر میں آئے فاصلے گھٹ رہے ہیں۔بموں اور اسلحے کی بولی چھوڑ کر پیار اور دوستی کی بولی میں بات کرنے کا رجحان پروان چڑھ رہا ہے۔دنیا کے دوسرے ممالک میں بھی پنجابی زبان اور پنجابی قوم کے وقار میں اضافہ ہوا ہے۔جس کام کا بیڑا فخر زمان نے اُٹھایا ہے اُس راہ پر وہ اکیلا نہیں۔اُس راستہ پر اب ایک قافلہ چل پڑا ہے اور یہ قافلہ اب آگے ہی

آ گے بڑھتا جائے گا۔ یہ کانفرنسیں دوسری زبانوں کی مخالفت کرنے کے لیے نہیں ہوتیں بلکہ یہ کانفرنسیں پنجابی بولی کو اس کا اصل مقام دلانے کے لیے منعقد کروائی جاتی ہیں۔

پاکستان کے سابق صدر جناب رفیق تارڑ نے کہیں جانا ہوگا اس لیے انہوں نے صدارتی تقریر سیشن کے درمیان میں کی۔ انہوں نے بتایا کہ صدارتی محل سے نکالے جانے کے بعد کسی بین الاقوامی کانفرنس کی صدارت کا اُن کے لیے یہ پہلا موقع ہے۔ انہوں نے اپنی شعروں سے آراستہ تقریر میں کہا کہ پنجابی زبان کے ساتھ انصاف ہونا چاہیے۔ اس فورم کو حکومتوں پر دباؤ ڈالنا چاہیے کہ پنجابی زبان کو اُس کا حق دیا جائے۔ ترقی یافتہ اقوام کو انسانیت کی بھلائی کے لیے آگے آنا چاہیے۔ بم اور بارود پر خرچ نہیں ہونا چاہیے کیونکہ بموں سے کبھی مسئلے حل ہوئے نہ کبھی ہوں گے۔ اس راستے کو ترک کر کے انسانی بھلائی کے راستے پر چلنا چاہیے۔ دنیا کے لیے امن ضروری ہے خاص طور پر اس خطے کے لیے امن بہت ضروری ہے تاکہ اس خطے سے غریبی اور ناخواندگی دور کی جا سکے۔ اُنہوں نے اس پُر ہجوم اجتماع کے لیے جناب فخر زمان کو مبارک باد دی اور ساتھ ہی اُن تمام کو بھی مبارک باد دی جو امن اور دوستی کے سفر پر گامزن ہیں۔

کینیڈا کی جانب سے صدارتی پینل میں بیٹھے ندیم پرمار نے بی۔سی (برٹش کولمبیا) کو ایک بڑا گاؤں کہا۔ وہاں پنجابی زبان کے لیے پرزور کوششوں اور ان کوششوں کے نتیجے میں پنجابی زبان کی ترقی کے متعلق بات کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ جو بات آپ دونوں پنجابوں والے کر رہے ہیں وہی بات ہم کینیڈا میں کرتے ہیں۔ سیشن کے آخر میں انڈین مینارٹی کمیشن کے چیئرمین ایس ترلوچن سنگھ نے خطاب کیا انہوں نے فخر زمان جی کو پنجابی زبان کے لیے جدوجہد جاری رکھنے پر مبارک باد دیتے ہوئے بتایا کہ ۱۹۷۴ء میں دوستی کے دشمنوں نے پنجابی کانفرنس نہیں کرنے دی تھی مگر خشونت سنگھ اور کلدیپ نیئر نے گیانی ذیل سنگھ کی آشیرباد سے امن کی طرف قدم اٹھایا اور سرحد پر موم بتیاں جگانے لگے۔ امن کے لیے یہ جدوجہد اب بھی جاری ہے۔

انہوں نے زور دے کر کہا کہ دروازے ہواؤں سے نہیں کھلیں گے بلکہ یہ جدوجہد سے ہی کھلیں گے۔ اگر عوام متحد ہو کر تحریک چلائیں تو دروازے بند رہ ہی نہیں سکتے۔ حکومتوں کو مجبور ہو کر عوام کے مسائل حل کرنے ہوں گے۔ عوام کی رہنمائی، لکھاری، صحافی اور دانشور کر سکتے ہیں۔

اب پنجاب ان دو پنجابوں تک ہی محدود نہیں ہے۔ پنجابی تو اب دنیا بھر کی پارلیمانوں تک پہنچ گئے ہیں۔ اب پنجابیوں کے لیے سرحدیں رکاوٹ نہیں بننی چاہئیں۔

ایس ترلوچن سنگھ کے خطاب کے ساتھ سیشن ختم ہوا تو شرکاء الحمرا آرٹ گیلری کی طرف چل پڑے۔ وہاں تالیوں کی گونج میں پاکستانی آرٹسٹ ایس۔ ایم منصور کے فن پاروں کی نمائش کا افتتاح ایس۔ ترلوچن نے کیا۔ اُن کے فن پارے شرکاء کی توجہ کا مرکز بن گئے۔ ہر شخص اُن کے کیے کام کی تعریف کر رہا تھا۔

نمائش کا چکر لگا کر شرکاء آہستہ آہستہ کھانے کی طرف چل پڑے۔ کھانے کا اہتمام الحمرا کے گراؤنڈ میں شامیانے لگا کر کیا گیا تھا۔ غیر ملکی وفود کے لیے علیحدہ میزیں لگائی گئی تھیں۔ مقامی شرکاء کے لیے علیحدہ میزیں تھیں۔ میزوں کے اِردگرد پیڈسٹل فین لگا کر گرمی سے بچاؤ کا بندوبست کیا گیا تھا۔ یہاں بھی پانی میں کئی طرح کے لوازمات شامل تھے۔

جیسے شادیوں میں بیرے ایک ٹرے لے کر خاص خاص مہمانوں کے پاس آ کر ٹپ طلب کرتے ہیں اُسی طرح یہاں بھی ایک بیرا کھانے کی ٹرے لے کر ہماری طرف آیا تو کنول مشتاق دور سے دوڑ کر بیرے کے پاس آیا اور اُسے جھڑک دیا ''یہ ہمارے مہمان ہیں ان کی سیوا کرنی ہے۔ کسی سے بھی ٹپ لینے کی اُمید نہ رکھنا۔ اگر وہ دیں تب بھی نہیں لینی۔ اگر ہمارے پاس تمہاری چھوٹی سی شکائت بھی آئی تو یہ تمہارے لیے بہتر نہیں ہوگا۔''

بیچارہ بیرا منہ لٹکائے واپس ہولیا۔

کھانے پر کئی نامور شخصیات سے جان پہچان ہوئی۔ پروفیسر عاشق رحیل صاحب سے تو نمائش ہال میں ہی ملاقات ہوگئی تھی۔ انہوں نے اپنا اُردو ماہنامہ ''عہد'' دیا۔

اس ماہنامے میں لیکھک منچ وینکوور کی رکن محترمہ فوزیہ منان شاہ کا افسانہ ''وارث'' چھپا ہوا تھا۔ اُن کے علاوہ پروفیسر سعید اجمل، میاں ظفر مقبول، ہارون قیوم، گورنمنٹ کالج پتوکی کے پرنسپل محمد عباس مرزا، محمد سلیم پاشا، میگزین پنچھی کے ایڈیٹر جاوید پنچھی اور سلطان کھاروی۔

کھانا کھا کے درختوں کی چھاؤں میں دو گھنٹے دوستوں سے گپ شپ میں صرف ہوئے۔

اگلا سیشن اُسی ہال میں ساڑھے تین بجے شروع ہوا۔ اے۔سی ہال میں داخل ہوتے ہی گرمی سے چھٹکارا مل گیا۔ اس سیشن کا موضوع تھا امن اور ثقافت، امن اور آرٹ، امن اور ادب اس سیشن کے صدارتی پینل میں جناب فخر زمان کے علاوہ مہمان خصوصی ایس ترلوچن سنگھ ہی تھے اور مہمانانِ خاص میں ڈاکٹر دلشاد ٹوانہ، مجاہد بریلوی، ڈاکٹر عادل سومرو، مسعود اشک اور محترمہ فرخندہ لودھی۔

باہر سے آئے شرکاء میں سے بلیر کنول اور کینیڈا کی طرف سے خادم یعنی جرنیل سنگھ سیکھا کو صدارتی پینل میں جگہ دی گئی۔

صدارتی پینل کی طرف سے کی گئی تقریروں میں ایک ہی بات پر زور تھا کہ اس خطے کو پہلے تمام ادوار سے زیادہ آج امن کی ضرورت ہے کیونکہ آج دنیا بارود کے ڈھیر پر بیٹھی ہے۔

ایک چھوٹی سی چنگاری ساری دنیا کو بھسم کر سکتی ہے۔ امن کی حفاظت کے لیے لکھاری سب سے زیادہ کردار ادا کر سکتے ہیں۔ ہر دور میں امن لہر میں لکھاریوں کا حصہ سب سے زیادہ تھا۔ اب بھی ادیبوں اور فن کاروں کو پیچھے نہیں رہنا چاہیے۔

میرے بولنے کی باری آئی تو میرا زور تھا کہ آج منڈی کلچر نے نئی نسل کو منشیات جیسے عیبوں میں مبتلا کر دیا ہے۔ ہمیں اپنے بچوں کی طرف دھیان دینے کی ضرورت ہے۔ سرمایہ داری نظام میں ورغلائے جا رہے ہیں اور امن کے لیے خطرہ ثابت ہو سکتے ہیں۔

بعض مقررین نے اپنے شعروں کے ذریعے موجودہ حالت کو بیان کیا جیسے

امبراں وچ بارود دا دھواں دھرتی اُتے اگ
موت سمندراں وچ پئی گھمدی میرے دور دا جگ

اب الگ ہو گئے ہیں تو خیال آتا ہے
ایک ہی گھر میں رہنا اتنا مشکل تو نہ تھا

میں چونکہ پردھانگی منڈل میں تھا اس لیے اس سیشن کے نوٹس نہ لے سکا۔ یہ سیشن پانچ بجے کے لگ بھگ ختم ہو گیا اور شرکاء کھانے کے لیے اسی پنڈال میں اکٹھے ہونے شروع ہو گئے۔

دوپہر کے کھانے کی طرح چائے کا بندوبست بھی تھا۔ غیر ملکی وفود کے لیے الگ بندوبست تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے غیر ملکی وفود کو زیادہ اہمیت دی جارہی ہے۔ غیر ملکی وفود کی چائے کے لیے گرم پانی علیحدہ، چائے کی پڑیاں، دودھ اور چینی علیحدہ علیحدہ لیکن باقی سب کے لیے بنی بنائی چائے۔ چائے کے ساتھ کھانے کے لیے چھوٹے چھوٹے سموسے، قسم قسم کے پکوڑے، بسکٹ اور چپس وغیرہ سارے شرکاء منتظمین کی طرف سے کھانے اور اُن کے حسن سلوک کی بہت تعریف کر رہے تھے۔

نئی ملاقاتیں دوستیوں میں بدل رہی تھیں۔ میرے گلے میں لٹکتے بیج پر لکھا کینیڈا اور سر پر پگڑی مقامی لکھاریوں سے ملاقات میں مددگار ثابت ہو رہی تھی۔ مقامی لکھاریوں میں ندیم پرمار ایک جانا پہچانا نام تھا۔ جو بھی اُسے ملنے آتا اس کی میرے ساتھ ملاقات تو ہونا تھی کیونکہ ہم ہر جگہ اکٹھے ہی جاتے تھے۔

ہر دیوڑ ائچ نے اپنے دوستوں کی الگ محفل سجائی ہوئی تھی۔

چائے پی کر باہر نکلے تو ''لہراں'' کے ایڈیٹر ڈاکٹر سیّد اختر حسین اختر سے میل ہو گئے۔ جب اختر حسین اختر صاحب کینیڈا کے دورے میں وینکوور آئے تھے تو میں اُن سے نہیں مل سکا تھا، اس مرتبہ میری خواہش تھی کہ اُن سے ملاقات ہو جائے۔ میں نے انہیں

دورانِ سیشن حاضری میں آ کر بیٹھتے دیکھ تو لیا تھا مگر سٹیج پر بیٹھنے کی وجہ سے اُن سے بات نہیں ہوسکتی تھی۔ وہ میرے چہرے سے واقف بھی نہیں تھے۔ اُن سے پانچ منٹ کے لگ بھگ ’’لہراں‘‘ کے پنجابی سیکشن کے متعلق بات ہوئی۔ انہوں نے پنجابی کے الفاظ کے جوڑ بند میں درپیش مشکلات کا ذکر کیا تو میں نے دل میں سوچا کہ آہستہ آہستہ یہ مشکل ہر طرف آئے گی اگر ہم پنجابی کو گرمکھی کے بجائے اور رسم الخطوں میں لکھیں گے۔ میں نے اختر حسین اختر جی کو ’’جے تیغ اننت‘‘ کی طرف سے بھیجی گئی نیک خواہشات پہنچائیں تو وہ جے تیغ کے پاکستان کے دورے کے متعلق باتیں کرنے لگے۔ اختر حسین اختر سے گفتگو کرتے کرتے میری نگاہ ۷۰، ۷۵ سال کے ایک سکھ صورت والے لمبے پتلے شخص کی جانب بار بار جانے لگی۔ وہ ایک ہی پل اپنی پگ کو سر سے اُتار لیتا تھا اور پھر ٹیڑھے میڑھے ڈھنگ سے سر پر لپیٹ لیتا تھا۔ سیشن کے دوران بھی وہ ہال میں بیٹھا اپنی پگ کو جھٹ بعد آڑی ترچھی لپیٹتا رہا۔ اب مجھ سے رہا نہ گیا، اختر حسین اختر کے ساتھ کچھ اور اصحاب آ کر باتوں میں لگ گئے اور میں اُس شخص کے پاس جا کر یہ کہنے سے باز نہ رہ سکا ’’سردار صاحب پگ سکھ دی شان ہُندی ہے۔ ایس نوں بار بار ڈھا بنھ کے پگ دی بےعزتی نہ کرو۔‘‘

(سردار صاحب پگ سکھ کی شان ہوتی ہے۔ اسے بار بار کھول باندھ کر پگ کی بےعزتی نہ کریں)

اُس نے میری طرف کڑوی نظروں سے دیکھا پر منہ سے کچھ نہ بولا۔ پگ کو ہاتھ میں پکڑ کر ہم سے دور چلا گیا۔ آج شام کے پروگرام میں فلم پروڈیوسرز کی طرف سے فلم ’’محبتاں سچیاں‘‘ کا مہورت الحمرا ہال نمبرا میں آٹھ بجے ہونا تھا۔ ’’محبتاں سچیاں‘‘ دکھانے کے بعد منتظمین کی جانب سے پرل کانٹی نینٹل ہوٹل میں آئے مہمانوں کے لیے کھانا دیا گیا تھا۔ اس سارے پروگرام کی میزبانی جناب خلیل رانا اور جناب شہزاد رفیق نے کرنا تھی مگر فلم والوں کے کسی عزیز کی وفات کی وجہ سے یہ سارا پروگرام ہی کینسل کر دیا گیا اس لیے ساڑھے چھ بجے ہی سارے شرکاء اپنے اپنے ٹھکانوں پر پہنچ گئے۔

میں نے اپنے کمرے پہنچتے ہی اشنان کرلیا اور اُس کے بعد ندیم پرمار واش روم چلا گیا۔ وہ ابھی واش روم میں نہا رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے اُٹھ کر دروازہ کھولا تو دروازے میں پاکستان کے نامور گائیک جناب شوکت علی ہاتھ میں بوٹوں والا ڈبا لیے کھڑے تھے انہوں نے بوٹوں والا ڈبا ٹیبل پر رکھا اور ہم بغلگیر ہوگئے۔ وہ گلے ملتے ہوئے ہنستے جا رہے تھے۔ رات کھانے پر ہماری اچھی جان پہچان ہوگئی تھی مگر اُن کی ہنسی کی مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ چھچھی چھوڑ کر جب میں نے اُن سے ہنسی کا سبب پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ رات بوتل میں پانی آپ نے جس ڈھنگ سے ڈالا، پھر اُس پانی کو پی کر جس طریقے سے ندیم صاحب کے آگے گلاس کیا اور انہوں نے پی کر جو ایکشن بنایا مجھے تو وہی سوچ سوچ کر ہنسی آ رہی ہے۔۔۔ میں رات کو بھی اکیلا لیٹا ہنستا رہا ہوں۔ اپنی بات ختم کر کے انہوں نے ندیم پرمار کے متعلق پوچھا تو میں نے ندیم کو آواز دے کر بتایا کہ شوکت صاحب آئے ہیں۔ شوکت علی صاحب نے وہ بوٹوں والا ڈبا ٹیبل سے اُٹھا کر میرے حوالے کر دیا تو اُس میں کوکڈن جن کی دو بوتلیں تھیں۔ بوتلیں دیکھ کر میں نے اُن سے کہا ''یہ تکلف آپ نے کیوں کیا۔ یہ تکلف نہیں کرنا چاہیے تھا۔ بوتل تو ہم نے ہوٹل سے ہی خرید لی تھی۔ غیر ملکی سیاحوں پر کوئی پابندی نہیں۔''

ہمارے لیے تو یہ ممنوع ہے پر آپ کے لیے تو نہیں۔ میرے کسی مِتر نے لا دی ہے۔ یہاں پر ٹھیکے تو ہیں نہیں ہمارا فرض بنتا ہے کہ مہمانوں کی خاطر داری کریں۔ سوا سے سنبھالیں اور عیش کریں ''عیش کی عیاشی'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

ندیم پرمار بھی اشنان کر کے واش روم سے آ گیا۔ اُسے وہ بغلگیر ہو کر ملے اور بڑی دیر تک سینے سے لگائے رکھا۔ انہوں نے پھر وہی رات والا واقعہ دہرایا اور ہنسنے لگے۔ کچھ رسمی باتوں کے بعد انہوں نے ندیم پرمار سے اُس کی غزلیں لینے کی درخواست کی۔ ندیم نے انہیں اپنی پانچ چھ غزلیں جو کہ اُن کے پاس موجود تھیں دے دیں۔ ہم نے بہت زور مارا کہ وہ کھانا ہمارے ساتھ ہی کھائیں مگر اُن کی بیگم کے ہسپتال میں داخل ہونے کی وجہ سے وہ

ہمارے پاس زیادہ دیر رُک نہیں سکتے تھے۔ وہ جاتے ہوئے کہنے لگے کہ کل شام کو ہونے والے کلچرل شو کے لیے بالکل نیا آیٹم تیار کیا ہے۔ یہ ایٹم آپ کے نام ہوگی۔

اُس کا مکھڑا ہی سناتے جائیں میں نے جھٹ سے فرمائش کر دی ''نہیں وہ آیٹم تو آپ کو سٹیج پر ہی سنایا جائے گا۔ پہلے سنا دیا تو اُس میں وہ مزا نہیں آئے گا۔''

شوکت صاحب جانے لگے تو میں نے سوغات کے طور پر اُن کے بیٹے کے لیے ایک پین دیا۔ پین لے کر پہلے انہوں نے اسے ماتھے پر رکھا پھر چھاتی کے ساتھ لگا کر شکریہ ادا کیا۔ پھر جپھیوں کا تبادلہ کر کے ہم سے اجازت لی۔

شوکت علی صاحب کے جانے کے بعد ندیم پرمار نے روم سروس والوں کو فون کر دیا۔ جو بیرا ہم سے آرڈر لینے آیا وہ کالج میں بی۔اے کا سٹوڈنٹ تھا۔ وہ اپنی پڑھائی کا خرچہ پورا کرنے کی غرض سے پڑھائی کے ساتھ ساتھ بیرا گیری کا کام بھی کر رہا تھا۔

بیرا ہمارے ساتھ آتے ہی گپ شپ میں مصروف ہوگیا۔ اس نے بتایا کہ ''میرے دادا کا دادا سکھ سے مسلمان بنا تھا۔ ہمارا گوت کنگ ہے ہم سادا سے جٹ کاشتکار ہیں۔ میں خود اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ میں بھی کہیں باہر سیٹل ہو جاؤں۔''

اُس بیرے کی باتوں سے یوں لگا جیسے بھارتی پنجاب کے نوجوانوں کی طرح یہاں بھی جائز ناجائز طریقے سے باہر جانے کی دوڑ لگی ہوئی ہو۔

کینیڈا، امریکہ جانے کی خواہش دونوں پنجابوں کی نوجوان نسل میں ایک جیسی ہی لگتی ہے۔ مگر دونوں پنجابوں کے گھبروؤں میں ایک فرق بھی نظر آیا۔ بھارتی پنجاب کی طرح یہاں نشے کی بھرمار نہیں۔

ہم نے اُسے یہی صلاح دی کہ ایجنٹوں کے چکر میں آ کر باہر کے ممالک میں بھاگنے کی کوشش نہ کرنا۔ بلکہ جیسے اب محنت کر کے پڑھ رہے ہو، اسی طرح اپنی پڑھائی جاری رکھنا۔ پڑھائی پوری کر کے صحیح طریقے سے باہر جانا۔ تمہیں تو عرب دیسوں میں نوکری

کرنے کی بہت سہولیتیں ہیں۔مگر وہ تو چاہتا تھا کہ کینیڈا، امریکہ کی طرف ہی نکلے۔

ہم نے اُسے آرڈر لکھوایا، وہ ''میں آیا'' کہہ کر واپس چلا گیا تو یکدم میرے ذہن میں پاکستان کے دورے سے گئے ایک دوست کی بات یاد آ گئی۔ اُس نے کہا تھا کہ پاکستان میں داخل ہوتے ہی سی۔آئی۔ڈی کے لوگ آپ کے ساتھ سائے کی طرح لگ جاتے ہیں اور آپ کو پتہ بھی نہیں چلتا۔ وہ قلیوں کے بھیس میں بھی ہو سکتے ہیں، بچوں کے بھیس میں بھی اور دوستوں کے بھیس میں بھی۔ خیال آیا کہ یہ لڑکا کہیں سی۔آئی۔ڈی کا آدمی ہی نہ ہو۔ پھر سوچا اگر سی۔آئی۔ڈی کا بھی ہو تو کیا فرق پڑتا ہے۔ ہم تو یہاں چار دِن کے لیے گھومنے اور کانفرنس اٹینڈ کرنے آئے ہیں۔ دو دِن بیت گئے ہیں۔ ان دو دِنوں میں ہمارا پنجابی کو پیار کرنے والوں سے ہی میل ہوا ہے۔ باقی دنوں میں بھی اُن کے ساتھ ہی میل ملاپ رکھیں گے اور ہماری کیا سرگرمیاں ہو سکتی ہیں۔

''پھر بھی احتیاط ضروری ہے۔'' دِل نے کہا۔

میں اپنے من کی گھمن گھیریوں میں ہی پھنسا ہوا تھا اور ندیم شیشے کے سامنے کھڑا اپنے تھوڑے سے بالوں کو کنگھی کرتا ہوا اپنی کوئی غزل گنگنا رہا تھا کہ وہی بیرا آرڈر لے کر آ گیا۔ ندیم نے اُسے بل کے ساتھ پچاس روپے ٹپ دی۔ وہ کہنے لگا سر مجھے ٹپ کی نہیں آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ آپ کے تو بہت سارے مسلمان دوست بھی ہوں گے۔ شادی وغیرہ کا چکر بھی چلا سکتے ہیں۔

ہم اُسے کیسے سمجھاتے کہ اگر امیگریشن اتنی آسان ہوتی تو ہمارے اپنے عزیز رشتے دار ہم سے ناراض نہ ہوتے۔ مگر ہم نے اتنا ہی کہا ''ٹپ تو تم رکھو باقی جو کچھ تمہارے لیے کر سکے ضرور کریں گے۔''

اُس نے ٹیبل سے ٹرے اُٹھاتے ہوئے کہا ''سر میری کل بھی روم سروس ہو گی، میں خود بھی آپ کی ضرورتوں کا پتہ کرتا رہوں گا۔ میں کل اپنا بائیو ڈیٹا بھی لیتا آؤں گا۔ آپ میرے بارے میں ضرور سوچنا۔'' شاید اُسے اور آرڈر لے کر جانے کی جلدی تھی۔ جلد ہی وہ

چلا گیا۔

(اگلے دِن ندیم پرمار کی صحت خراب ہونے پر شام کے وقت اُس کا پتہ کیا تو پتہ چلا کہ وہ آج چھٹی کر گیا ہے۔ پھر وہ بیرا نہ ہی ہمیں ملا اور نہ ہی اُس نے اپنا بائیوڈیٹا دیا)

ابھی ہم کھانے پینے کی تیاری میں ہی تھے کہ کنول مشتاق اپنے ایک ساتھی کے ہمراہ ہمارے کمرے میں آ گیا۔ آج کے باقی پروگرام کینسل ہونے کی وجہ سے وہ فارغ ہی تھے۔ اُس نے آج ہوئے پروگراموں اور کھانے کے متعلق ہماری رائے جاننا چاہی۔ کنول مشتاق کانفرنس کے خاص منتظمین میں سے تھا۔ وہ عالمی پنجابی کانگریس کا جنرل سیکریڑی ہے اور مشاعرہ کمیٹی کا صدر بھی پر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کانفرنس کے انعقاد کی ساری ذمہ داری اُس نے اپنے کندھوں پر اُٹھا رکھی ہو۔ ہم نے انہیں کل اور آج کے تمام امور صحیح ڈھنگ سے انجام پانے پر مبارک باد دی۔ مختلف سیشنز میں زیادہ مقررین کو نہ بلانے اور صرف صدارتی پینل کے مقررین کو ہی دو دو منٹ کا وقت دینے کے متعلق بتایا کہ یہ روائت پسند آئی ہے، کھانے کے بندوبست پر بھی ہم نے انہیں داد دی۔

کچھ دیر کانفرنس کی باتیں ہوتی رہیں پھر اصل مقصد کی طرف آتے ہوئے کنول نے بتایا کہ انہوں نے پاکستان میں ''سورج مکھی'' نام کے ایک علمی ادارے کی بنیاد رکھی ہے۔ وہ کینیڈا میں بھی اس ادارے کی شاخیں کھولنا چاہتے تھے اسی مقصد کے لیے وہ ہمارے ساتھ تبادلہ خیال کرنے آئے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ ''سورج مکھی'' ادارے کا بڑا مقصد پنجابی بولی پرچار ہے۔ وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ پنجابی زبان دونوں پنجابوں کے ساتھ ساتھ پوری دنیا میں پھیل گئی ہے مگر اسے پڑھنے کے لیے رسم الخطوں کی رکاوٹ درپیش ہے۔ اس رکاوٹ کو دور کرنے کے لیے اُن کا پہلا قدم ایک میگزین ''سورج مکھی'' کی اشاعت ہے جو کہ پنجابی ادب کو تین رسم الخطوں (گرمکھی، شاہ مکھی اور رومن) میں شائع کرے گا۔ انہوں نے تجربے کے طور پر ''سورج مکھی'' کا شائع شدہ کتابچہ ہمیں دکھایا۔ اُن کا خیال تھا کہ آغاز میں سورج مکھی کا سائز چھوٹا رکھا جائے گا۔ جیسے جیسے ادارے اور میگزین

کی ممبر شپ بڑھتی جائے گی۔ اس کا سائز بھی بڑھایا جاتا رہے گا۔ کنول مشتاق ''سورج مکھی'' ادارے کے قواعد وضوابط کے متعلق بتا ہی رہا تھا کہ ہمیں ملنے کے لیے ''پنچھی'' کے ایڈیٹر جاوید پنچھی اور اُن کے دوست سلطان کھاروی (جو کہ پنجابی کے بہت اچھے شاعر ہیں اور انہوں نے بچوں کے لیے بھی پنجابی میں کتابیں لکھی ہیں) آ گئے۔ ابھی اُن سے کوئی بات چیت بھی نہ ہوئی تھی کہ میگزین ''پکھیرو'' کے ایڈیٹر جناب اشرف سہیل، اُردو ماہنامہ ''عہد'' کے دو ایڈیٹر جناب پروفیسر عاشق رحیل اور جناب حامد بٹ کمرے میں داخل ہوئے۔ اُس وقت سب کی طرف توجہ دینا ہمارے بس میں نہ تھا۔ ان سارے متر پیاروں کا ہم سے لگاؤ ہی انہیں ہمارے پاس لے آیا تھا اس لیے اُن سے تبادلہ خیال ہم پر فرض بھی تھا۔ چنانچہ مطلب کی باتیں چھوڑ کر مشترکہ دلچسپی کی باتیں شروع ہو گئیں۔ مطلب کی بات یہ ہے کہ ہر اخبار نویس کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کا اخبار دور دراز علاقوں میں بھی لوگوں تک پہنچے مگر یہاں مسئلہ یہ تھا کہ یہاں کے سارے ہی اخبار اور میگزین شاہ مکھی میں تھے اور کینیڈا میں شاہ مکھی جاننے والے پنجابی اُنگلیوں پر گنے جا سکتے تھے اور ان میں سے بھی زیادہ تر کی دلچسپی پڑھنے میں بالکل نہیں تھی۔ خیر اُن میں سے کسی نے اس کے متعلق بات بھی نہیں کی۔ کینیڈا میں پنجابی کی صورت حال اور دونوں پنجابوں میں شائع شدہ ادب کے تبادلے کے متعلق ہی بات ہوتی رہی۔

ابھی ان کے ساتھ تبادلہ خیال ہو رہی رہا تھا کہ ندیم پرمار کے قلمی دوست عمر غنی اپنے ایک ساتھی کے ساتھ ندیم پرمار سے ملنے آ گئے وہ آج رات ہی اجمیر شریف (انڈیا) جا رہے تھے۔ عمر غنی پنجابی کے مشہور غزل گو ہیں۔ ہمارے ساتھ بات چیت کے لیے اُن کے پاس صرف دس پندرہ منٹ ہی تھے۔ دوبارہ چونکہ اُن سے ملاقات نہ ہو سکتی تھی اس لیے ہر طرف سے توجہ ہٹا کر اُن سے بات چیت ہونے لگی۔ صورت حال کو بھانپتے ہوئے تمام ایڈیٹرز کل دوبارہ آنے کا کہہ کر چلے گئے۔ پروفیسر عاشق رحیل سے کل ملنے کا وعدہ ندیم پرمار پہلے ہی کر چکا تھا۔

عمر غنی اور ندیم اپنے خطوط کے تبادلے اور دوسری روزمرہ کی گفتگو کرنے لگے۔ میں ایک طرف ہوکر کچھ پڑھنے لگا۔ ابھی میں نے ''پکھیرو'' میگزین کا ٹائٹل ہی دھیان سے دیکھا تھا جس میں ایک سوکھے درخت میں ایک پنچھی کا گھونسلہ ہے۔ گھونسلے میں دو ''بوٹ'' منہ کھولے ''چوگا'' مانگ رہے ہیں۔ درخت کے ''مُڈھ'' کے ساتھ دو بچے کھڑے ہیں۔ ایک جوڑے والا اور ایک ''مونا'' ٹائٹل پر شاہ مکھی حروف میں لکھا ہوا ہے۔

''چڑھدے لہندے پنجاب دے بال گیت۔''

کچھ دیر پہلے اس میگزین کے ایڈیٹر جناب اشرف سہیل ہمیں یہ میگزین دے کر گئے تھے۔ ابھی میں نے اس کے صفحے بھی نہ اُلٹائے تھے کہ کنول مشتاق اور اُن کے ساتھی دوبارہ آ گئے۔ اُسی وقت عمر غنی جی نے بھی جانے کی اجازت چاہی۔ وہ کمرے سے باہر نکلے، میں نے گھڑی کی طرف نگاہ دوڑائی، گھڑی کی سوئیاں رات کے سوا دس بجا رہی تھیں۔ کھانے کا وقت نکلتا جا رہا تھا۔ ہم نے کنول مشتاق سے کہا کہ وہ ہمارے ساتھ ہی کھانا کھائیں لیکن انہوں نے کہا کہ آپ کھانا کھالیں ہم یہیں کمرے میں انتظار کرتے ہیں۔

انہیں کمرے میں چھوڑ کر ہم کھانا کھانے چلے گئے۔ جب ہم کھانا تناول کر کے کمرے میں واپس آئے تو ایک چھ فٹ کا جوان بھرے جُسّے والا، جس کی شخصیت بڑی متاثر کن تھی، کنول مشتاق کے ساتھی کے ہمراہ کمرے میں آ گیا۔ اُس کا تعارف کنول مشتاق نے کروایا۔ یہ نثار احمد چوہدری عرف سنی صاحب ہیں یہ ''پنج پانیاں دی وراثت'' کے چیئر مین ہیں۔ ''پنج پانیاں دی وراثت'' ایک عالمی ادارہ ہے جس کا ہیڈ کوارٹر جلندھر میں ہے اور اُس کے چیئر مین جلندھر ڈویژن کے کمشنر ہیں۔

نثار احمد چودھری ''پنج پانیاں دی وراثت'' کی پاکستان اکائی کے چیئر مین ہیں۔ انہوں نے کچھ عرصہ پہلے جلندھر میں بڑا زبردست ثقافتی میلہ کروایا تھا جس میں انڈو پاک کے چوٹی کے فن کاروں نے شرکت کی تھی۔ اُن کے آنے سے سورج مکھی ادارے والی بات

پھر درمیان میں ہی رہ گئی اور بات ''پنج پانیاں دی وراثت'' کی طرف سے کروائے جا رہے میلوں سے چلتی ہوئی انڈو پاک رشتوں میں آئی بہتری کی طرف مڑ گئی۔ اس بہتری کے پیچھے کون سی طاقتیں کارفرما ہیں، انڈو پاک رشتوں میں دوری کے لیے کون سی طاقتیں کام کر رہی ہیں اور ان ممالک کے دور دور رہنے سے ان طاقتوں کو کیا فائدہ حاصل ہوتا ہے جیسے موضوعات پر گفتگو ہونے لگی۔ بات یہیں ہی نہیں ٹھہری۔ باتوں سے بات نکلتی ہوئی عالمی واقعات تک جا پہنچی، گفتگو کرنے والے چودھری صاحب تھے باقی سامعین تھے جو کبھی کبھار ہاں میں ہاں ملا دیتے۔ گفتگو کے دوران ہی چودھری صاحب نے ہمیں تمام گردواروں کے درشن کروانے کی ذمہ داری بھی لے لی اور ہمارے موبائل فون کے لیے سم مہیا کرنے کا وعدہ بھی کر لیا۔

رات بارہ سے اوپر ہو چلی تھی۔ ندیم پرمار کو بے کلی سی محسوس ہو رہی تھی۔ میری آنکھیں بھی نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ باتیں تو ختم ہونے میں ہی نہ آ رہی تھیں مگر وہ ہماری نیند کا خیال کرتے ہوئے کل دوبارہ ملنے کا وعدہ کر کے رُخصت ہو گئے۔



دردیلا دِن

بستر میں لیٹے دو گھنٹے بھی نہ گزرے تھے جب مجھے خواب میں یوں لگا جیسے کوئی دور سے آوازیں دے رہا ہو۔ میں آواز کے پیچھے جانے کی کوشش کرتا ہوں مگر مجھ سے چلا نہیں جا رہا۔

آواز پھر دوبارہ میرے نزدیک سے آتی ہے۔ مگر میرا جسم ساتھ نہیں دیتا۔ آواز اور اُونچی ہو جاتی ہے تو میرے کان سن لیتے ہیں۔ ندیم پر مار مجھے آوازیں دے رہا تھا۔ میں اُٹھ کر بیٹھ جاتا ہوں، ''کیا بات ہے طبیعت تو ٹھیک ہے۔''

''مجھے بہت سردی لگ رہی ہے، میں نے بہت آوازیں دیں تم گھوڑے بیچ کے سو رہے تھے مجھ سے تو اُٹھا بھی نہیں جا رہا۔ مہربانی کر کے اے۔سی بند کر دو۔

میں نے اُٹھ کر اے۔سی بند کر دیا۔ اُسے کھانے پینے کے متعلق پوچھا مگر اُس نے سر پھیر کر نہ کر دی اور کچھو مچھو ہو کر لیٹا رہا کچھ دیر بعد کمرے کا موسم گرم ہو گیا مجھے بے چینی سی محسوس ہونے لگی مگر ندیم کہہ رہا تھا کہ اُسے اب بھی ٹھنڈ لگ رہی ہے۔ لگتا تھا جیسے اُس کا بلڈ پریشر کم ہو گیا ہو۔

میں نے اپنا کمبل اُسے دے دیا۔ کچھ دیر تک تو وہ ٹھٹھرتا رہا مگر پھر سکون سا آ گیا۔ جب اُسے نیند آ گئی تو میں بھی بے فکر ہو کر سو گیا۔ گھنٹہ بھر اچھی نیند آئی مگر پھر لابی سے آنے والی آوازوں نے نیند خراب کر دی۔ اب سونے کی کوئی تک نہ تھی چنانچہ میں اُٹھ کر واش روم چلا گیا۔ قریباً پندرہ منٹ بعد جب میں نہا کر نکلا تو کمرے میں ''پنچھی'' کے ایڈیٹر جاوید پنچھی، سلطان کھاروی اور اُن کے ساتھ میگزین ''رویل'' کے ایڈیٹر عاشق علی فیصل موجود تھے اور ندیم پرمار اُن کے ساتھ باتوں میں مصروف تھا۔ میں نے اُس کی صحت کے متعلق پوچھا تو اُس نے بتایا کہ ٹھیک ہے۔

میرا فکر جاتا رہا اور میں مہمانوں کے ساتھ شریک گفتگو ہو گیا۔

عاشق علی فیصل کا خیال تھا کہ باہر سے آئے مہمانوں کو اپنی زیادہ سے زیادہ کتابیں لے کر آنا چاہیے تاکہ جو لوگ یہاں گرمکھی سکرپٹ جانتے ہیں وہ اُن کتابوں سے مستفیض ہو سکیں۔

ہم نے انہیں اپنی مجبوری سے آگاہ کیا۔ کینیڈا سے پہلے انڈیا کتابیں لے کر آنا اور پھر پاکستان اُٹھا کر لانا بڑی مشقت کا کام ہے۔ دوسری بات یہ کہ پبلشرز سے قیمتاً کتابیں لا کر یہاں مفت تقسیم کرنا بھی بڑا مہنگا عمل محسوس ہوتا ہے۔ پھر بھی کتابوں کے چھ سیٹ لائے تھے جو کہ نامور شخصیات اور کچھ رسالوں کے مدیران کو عنائت کر دیے۔

پاکستان میں پنجابی زبان کا ہر اچھا لکھاری گرمکھی سکرپٹ پڑھ لیتا ہے۔ میری جتنے بھی لکھاریوں سے بات چیت ہوئی انہیں گرمکھی رسم الخط سے شناسائی تھی۔ یہ بہت اچھی روائت ہے۔ اس طرح وہ دوسرے پنجاب اور تیسرے پنجاب☆ میں چھپی کتابیں پڑھ سکتے ہیں۔ اس کے برعکس گرمکھی سکرپٹ میں لکھنے والے لکھاری یا وہ لکھاری جن کا جنم ۱۹۴۷ء کے بعد ہوا ہے شاہ مکھی سے کم واقفیت رکھتے ہیں۔ یہ پنجابی ادب کے لیے عذاب سہنے والا

☆ پنجابی لکھاری انڈیا اور پاکستان کے علاوہ باقی دنیا میں بسے پنجابیوں کے لیے تیسرا پنجاب کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں

معاملہ ہے۔ میری رائے تو یہ ہے کہ دونوں پنجابوں میں عوام کو دونوں ہی رسم الخط پڑھائے جانے چاہئیں۔ بہت بدنصیب وقت تھا جب سیاسی لیڈروں نے انڈیا میں اُردو اور پاکستان میں پنجابی پڑھانا بند کر دیا لیکن اب تو پانی کو بلونے والی بات تھی۔ اب پھر ہر طرف پنجابی کی بات چلی تو ہے۔ انہوں نے ہمیں اپنی کچھ کتابیں اور رسالے عنائیت کیے۔ جو ہم نے شکریے کے ساتھ قبول کر لیے۔

اُن تینوں دوستوں نے ہمارے ساتھ ناشتہ کیا اور پھر الحمرا کی طرف چلے گئے۔ ہم نے اپنے کمرے میں آ کر آرام کیا۔ ندیم اپنے آپ کو پوری طرح صحت یاب محسوس نہیں کر رہا تھا۔ اُس نے ناشتے میں بھی چائے کے ساتھ بریڈ کا پیس ہی لیا تھا۔ اُس کا پروگرام تو آرام کرنے کا ہی تھا مگر وہ کانفرنس کا کوئی سیشن چھوڑنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ میری خواہش تو کانفرنس کے مکمل سیشنز اٹینڈ کرنے اور ان کے متعلق لکھنے کی تھی۔ ہم ابھی شش و پنج میں ہی تھے کہ کوچ کے ڈرائیور یار محمد کا فون آ گیا کہ فوراً نیچے پہنچ جائیں۔ آپ کا ہی انتظار کیا جا رہا ہے۔ ہم کوچ کے پاس پہنچے تو یار محمد بولا ”بادشاہو آج لیٹ کیسے ہو گئے۔ یہ سب کوچ کی روانگی کے لیے کہہ رہے تھے۔ میں نے کہا جب تک ہمارے کینیڈین دوست نہ آ جائیں کوچ کیسے روانہ ہو سکتی ہے۔“ میں نے دیر کی وجہ ندیم کی بیماری بتائی تو وہ اس کی تندرستی کے متعلق بات کرتے ہوئے کہنے لگا کہ ہم زیادہ لیٹ نہیں ہیں۔ پروگرام ساڑھے گیارہ سے پہلے شروع نہیں ہو گا۔

پولیس اسکارٹ کی راہنمائی میں ہم دس منٹ میں الحمرا ہال پہنچ گئے۔ ہال میں کل گایا گیا خیر مقدمی گیت ”بوہے کھولھ دیو، باریاں کھولھ دیو“ سکرین پر دکھایا جا رہا تھا۔ آج ہال پورا نہیں بھرا تھا۔ ہال میں داخل ہوتے ہی الیاس گھمن سے ملاقات ہو گئی۔ وہ کینیڈا کے ساتھیوں کے متعلق بات کرنے لگے۔ اُن کے کینیڈا میں بہت سارے قلمی دوست ہیں اور اُن کا کینیڈا کا چکر بھی لگ چکا ہے۔ اُن کی تخلیقات روزنامہ اجیت میں چھپتی ہی رہتی ہیں۔ اس لیے وہ دونوں پنجابوں کے ہی چہیتے لکھاری ہیں۔ اب بھی وہ کانفرنس کی مکمل روداد کی

رپورٹیں مشرقی پنجاب کے اخباروں کو بھیج رہے تھے۔ اُن سے مل کر دلی خوشی ہوئی کیونکہ ہم کل سے ہی انہیں ملنے کا ارادہ کر رہے تھے۔ اس جیسے اجتماعات میں کھل کر بات چیت کرنے کا وقت نہیں مل پاتا صرف حال چال کا تبادلہ ہی ہو پاتا ہے۔ الیاس گھمن کسی اور سے محو گفتگو ہوئے تو ہمارے ساتھ پنجابی شاعر عبدالکریم قدسی آ شامل ہوئے۔

جب یہ سیشن شروع ہوا تو پونے بارہ بج چکے تھے۔ سیشن لاہور کے میئر میاں عامر محمود کی صدارت میں ہو رہا تھا۔ صدارتی پینل میں بھی غیر ملکی شرکاء کو نمائندگی دی گئی تھی۔ کینیڈا کی طرف سے ہر دیو سنگھ وڑائچ کو بٹھایا گیا۔ اس کے علاوہ صدارتی پینل میں محترمہ ثروت محی الدین، حسین نقی، محترمہ طاہرہ مظہر علی، خالد حسین، تاج محمد امر، ازبکستان سے اٹیچی شروز، ایس فیاض، فخر زمان اور ایس ترلوچن سنگھ بھی سٹیج پر موجود تھے۔

آج کے سیشن کا عنوان ''امن اور میڈیا'' رکھا گیا تھا۔ مگر امن کے لیے میڈیا کے رول پر زیادہ بات نہ ہو سکی۔ پہلے سیشنوں کی طرح کھلی بات ہی چلی۔ اس سیشن میں کچھ کتابیں بھی ریلیز کی گئیں۔ جن میں عالمی پنجابی کانگریس کی طرف سے چھاپی گئی دو کتابیں، ورلڈ پنجابی کانفرنس لاہور ۲۰۰۴ء اور انگریزی میں لکھی کتاب ''امن کی تلاش'' شامل تھیں۔

صدارتی پینل کے مقررین میں سے محترمہ طاہرہ مظہر علی نے شرکاء کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ لاہور میں پگ والوں کو دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی ہے۔ دونوں ملکوں میں لوگوں کا آنا جانا ہونا چاہیے۔ بیوپاری طبقہ پنجابی کو اُجڈ زبان سمجھتا ہے اور بولنے سے گریز کرتا ہے۔ انہوں نے فخر سے کہا کہ آزادی کے وقت انہوں نے اپنی پہلی تقریر پنجابی میں ہی کی تھی۔ ہم سب پنجابیوں کو پنجابی میں بات کرتے ہوئے فخر محسوس کرنا چاہیے۔ انہوں نے اپنی تقریر اس شعر پر ختم کی:

ٹھنڈیاں چھاواں، مٹھڑے میرے گیت
جی آیاں نوں آکھنا ایہو ساڈی رِیت

انڈین جموں کشمیر سے آئے ہوئے ایک آئی۔ سی۔ ایس افسر خالد حسین نے کہا

کہ اگر کسی زبان کا استعمال نہ کیا جائے تو آہستہ آہستہ وہ ختم ہو جاتی ہے۔ انہوں نے اپنی مثال دیتے ہوئے کہا کہ جیسے میں ڈوگری کو بھول گیا ہوں۔ انہوں نے زور دے کہا کہ دونوں پنجابوں کے لوگوں کو دونوں رسم الخط سیکھنے چاہئیں۔

تاج محمد امر نے اپنی تقریر پشتو میں کی جس کی سمجھ نہیں آئی نہ اُن کی تقریر کا ترجمہ ہی کسی نے کیا۔ ہردیو سنگھ وڑائچ نے نظم کے ذریعے دونوں ملکوں کو میل ملاپ کا پیغام دیا۔ محترمہ نسیم اختر نے فخر زمان جی کو خراجِ تحسین پیش کیا اور پنجابی کے لیے اتنا کام کرنے پر مبارک باد دی اور یہ شعر پڑھے:

اج توڑ فریب دے جال آئی آں
ہن لنگھ اشارے لال آئی آں
بجھے سن جو دیوے راہاں دے
اج اوہ سارے بال آئی آں

اس کے بعد شاعر ندیم نے اپنی نظم میں تقسیم پیدا کرنے والوں پر تنقید کی۔ محترمہ ثروت محی الدین نے اپنی تقریر میں کہا کہ ازل سے ہی طاقت ور کمزوروں پر غالب ہیں۔ طاقت وروں کا مقابلہ متحد ہو کر ہی کیا جا سکتا ہے۔ جب تک ہم متحد نہیں ہو جاتے طاقت ور ہمیں لوٹتے اور مارتے رہیں گے۔ اُن کا یہ بھی کہنا تھا کہ ہر شخص کی ایک علیحدہ سوچ ہوتی ہے۔ یہ سوچ مسائل پیدا کرتی ہے لیکن آخر اس کا فائدہ ترقی کی صورت میں ملتا ہے۔

اُس کے بعد جناب فخر زمان نے لاہور کے میئر (ناظم) کے سامنے کچھ مطالبات رکھے جیسا کہ:

۱۔ لاہور میں پرائیویٹ سیکٹر میں ایک پنجابی یونیورسٹی قائم کی جائے۔

۲۔ پرائمری سے کالج تک پنجابی کو تعلیم کا حصہ بنایا جائے۔

۳۔ لاہور کی سڑکوں اور چوکوں کے نام، حملہ آور لیٹروں کے نام پر نہیں بلکہ شہیدوں، لکھاریوں، صوفیوں اور فن کاروں کے نام پر رکھے جائیں۔ جیسے شادمان چوک کا نام

بھگت سنگھ چوک رکھا جائے اور نیلا گنبد چوک کا نام دلا بھٹی چوک رکھا جائے۔شہید تمام اقوام کے لیے سانجھے ہوئے ہیں۔شہیدوں کی تقسیم نہیں کی جانی چاہیے۔

فخر جی کے مطالبات کے جواب میں لاہور کے ناظم میاں عامر محمود نے کہا کہ دونوں پنجابوں کی دوستی کا آغاز انہی کانفرنسوں سے ہوا ہے۔ یہ دوستی پکی ہوتی جارہی ہے کیونکہ دوستی کی باگ ڈور سیاستدانوں کے ہاتھوں سے نکل کر عوام کے ہاتھوں میں آ گئی ہے۔ انہوں نے اس تحریک کی قیادت پر فخر زمان جی کو مبارک باد دی۔مطالبات کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ابھی یہ وقت نہیں آیا۔اس کام کے لیے ابھی اور وقت درکار ہے۔انہوں نے یہ بھی کہا کہ ہر قوم کے اپنے ہی شہید ہوتے ہیں۔اپنی تقریر ختم کرنے کے بعد لاہور کے میئر کوئی اور فنکشن اٹینڈ کرنے چلے گئے۔فخر زمان جی اور کچھ اور شخصیات انہیں الوداع کہنے کے لیے سٹیج سے اُٹھ کھڑے ہوئے جس کی وجہ سے فنکشن کچھ دیر کے لیے رُک گیا۔

اُس کے بعد سٹیج پر موجود دوسرے مقررین نے خطاب کیا۔اُن کا خیال تھا کہ بیوروکریسی چاہے اس طرف کے پنجاب کی ہو چاہے اُس طرف کے پنجاب کی، اُس نے ہمیشہ ہی پنجابی کی مخالفت کی ہے۔یہی وہ لوگ ہیں جو نفرت کے بیج بونے میں اپنا اپنا حصہ ڈالتے رہے۔اب میڈیا کو آگے آنا چاہیے اور امن، دوستی اور پنجابی کے فروغ کے لیے اپنا کردار ادا کرنا چاہیے۔

آخر میں ایس ترلوچن جی نے اپنی تقریر میں کہا کہ انڈین حکومت نے بانئ پاکستان محمد علی جناح کے ممبئ والے آبائی مکان کو حکومتِ پاکستان کے حوالے کر دیا ہے۔انہوں نے دونوں حکومتوں کو کچھ مشورے بھی دیے۔

۱۔ سٹوڈنٹس کو دونوں طرف آنے جانے کی اجازت ہو۔

۲۔ کتابوں کا آنا جانا آسان بنایا جائے۔

۳۔ دونوں رسم الخطوں (گرمکھی، شاہ مکھی) کو پڑھائی کا حصہ بنایا جائے۔

انہوں نے بھارتی وفد کو ویزے مل جانے کا ذکر بھی کیا۔

ترلوچن سنگھ اور فخر زمان جی کے اظہارِ خیال کے ساتھ ہی یہ سیشن اختتام پذیر ہو گیا۔ اُس کے بعد انڈین پارلیمنٹ کا اجلاس شروع ہونے کی وجہ سے ترلوچن سنگھ جی انڈیا چلے گئے۔

سیشن ختم ہوتے ہی ہم کھانے والے پنڈال میں چلے گئے۔ ہم پنڈال میں کھانے کی میزوں کے پاس آئے تو کھانے میں کئی ڈشیں تھیں۔

دل ہر ڈش چکھنے کو چاہ رہا تھا مگر اپنی صحت کا خیال کرتے ہوئے چاولوں کے ساتھ ایک دو سبزیاں اور رائتہ ہی لیا۔

ندیم کچھ بھی نہیں کھا رہا تھا۔ میرے کہنے پر اُس نے چاول کے ساتھ تھوڑا سا رائتہ لیا۔ پنڈال میں پنکھوں کا مناسب بندوبست تھا لیکن گرمی پھر بھی محسوس ہو رہی تھی۔ چنانچہ ہم پنڈال سے باہر درختوں کی چھاؤں میں آ گئے۔ یہاں ہمیں ایک خاتون پروفیسر ملیں جنہوں نے اپنے آپ کو پنجابی کے فروغ کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ وہ ہمیں یہاں پنجابی کے لیے کیے جا رہے کام کی تفصیل بتا رہی تھیں۔ انہوں نے کالجوں میں پنجابی پڑھائی کے لیے بہت کوششیں کیں۔ آج کل وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں پنجابی پڑھا رہی تھیں۔ اُن کے ساتھ ایک اور خاتون پروفیسر آ کھڑی ہوئیں۔ اُن کا نام ایم۔ زیڈ کنول تھا۔ وہ مغربی پنجاب کی ایک ادبی تنظیم انجمنِ ادب کی رُکن تھیں اور مئی میں ہونے والے الیکشن میں اُمیدوار تھیں۔ انہوں نے اپنا تعارف کرواتے وقت ایک کتابچہ بھی دیا جس سے اُن کی قابلیت کا پتہ چلتا تھا۔ انہوں نے ایم۔ اے اُردو، پنجابی کر کے ایم ایڈ کیا ہوا تھا۔ آل راونڈ بیٹ سٹوڈنٹ کا اعزاز پا چکی تھیں۔ ایم ایڈ کی گولڈ میڈلسٹ تھیں۔ مشاعرہ ڈبیٹ (بیت بازی) میں بھی گولڈ میڈل حاصل کر چکی تھیں۔ عورتوں کی فلاح و بہبود کے لیے کام کر رہی تھیں۔ وہ غیر ممالک میں جا کر عورتوں کی حالت کے متعلق معلومات حاصل کرنے کی خواہش مند تھیں۔ ہم نے اُن کی ہمت، دلیری اور کئی شعبوں میں خدمات سرانجام دینے کی صلاحیت کی داد دے رہے تھے کہ ندیم کی طبیعت خراب ہونے لگی۔ میں نے اُسے آہستہ آہستہ چل کر

ہال میں بیٹھنے کو کہا۔ اُس نے کہا کہ مجھ سے تو ایک قدم بھی نہیں اُٹھایا جا رہا۔

اتنا کہہ کر اُسے چکر آ گیا اور وہ گرنے لگا۔ میں نے اُسے کلاوے میں لے کر گرنے سے بچایا اور آہستہ آہستہ نیچے بٹھا دیا۔ بیٹھتے ہی اُسے قے آ گئی کپڑے بھی خراب ہوئے، ساتھ میرے کپڑوں پر بھی چھینٹے پڑ گئے۔ اُس کی یہ حالت دیکھ کر میں تو بہت گھبرا گیا کیونکہ ندیم کے دِل کا آپریشن ہو چکا ہے اور اس وقت اس کے دِل پر پیس میکر (Pacemaker) لگا ہوا ہے۔ قے کے بعد اُس کے ماتھے پر پسینہ آ گیا تھا۔ میں نے سمجھا اُسے پھر ہارٹ پرابلم آ گئی ہے۔ میں نے پاس کھڑے ایک رائٹر سے کہا کہ جلدی کنول مشتاق کو بلا لائے۔ دوسری جانب لاہور کالج کی پروفیسر نے اپنے ڈرائیور کو آوازیں دینی شروع کر دیں کہ جلدی کار لے کر آ جائے۔ ڈرائیور کار لینے دوڑ پڑا اور وہ مہرباں عورت ندیم کو سنبھالنے میں میری مدد کرنے لگی۔ اتنے میں ایک اور ہمدرد اپنی کار لے کر آ گیا۔

ندیم پر مار بے ہوشی کی حالت میں تھا۔ ہم نے فوراً اُسے کار میں ڈالا۔ کنول مشتاق بھی وہاں پہنچ گیا۔ اُس کے ساتھ عبدل ساحر بھی تھا۔ کار گیٹ سے نکل کر جلد ہی ہسپتال کے ایمرجنسی کی طرف روانہ ہوگئی۔ اس دوران ندیم پر مار کو ہوش آ گیا۔ اسے اپنی بیماری اور صحت کے متعلق علم ہو چکا تھا۔ کہنے لگا ''ایمرجنسی جانے کی ضرورت نہیں، مجھے ہوٹل چھوڑ آؤ۔''

''نہیں، تمہاری حالت ٹھیک نہیں۔ ہمیں ہسپتال ضرور جانا چاہیے۔''

''سیکھا مجھے اپنی حالت کا زیادہ پتہ ہے۔ ہسپتال کی بجائے ہوٹل کی طرف چلو۔'' ندیم نے حکمیہ لہجے میں کہا۔

کنول مشتاق اور عبدل ساحر کا خیال تھا کہ ڈاکٹر سے چیک اَپ کروانے میں کوئی حرج نہیں۔ مگر میں نے کہا کہ ہمیں ندیم کی بات ماننی چاہیے۔ چنانچہ ہم ایمبیسیڈر ہوٹل میں اپنے کمرے میں آ گئے۔ ندیم لفٹ کی بجائے سیڑھیاں چڑھ کر کمرے میں پہنچا۔ روم سروس والوں کو فون کر کے سکنجبین منگوائی۔ ایک دو گھونٹ پی کر باتیں کرنے لگا اُس نے بتایا کہ

ایک تو رات دیر تک بیٹھے رہنے سے اور دیر سے کھانا کھانے سے کھانا ہضم نہیں ہوسکا، نیند نہ آنے سے بلڈ پریشر لو ہو گیا تھا اور پھر آرام نہ کرنے کی وجہ سے حالت بگڑتی گئی۔

''ایمرجنسی ہسپتال نہ جانے کی وجہ یہ تھی کہ مجھے اپنے دل کی حالت کا تو پتہ ہی تھا۔ ڈاکٹرز نے مجھے ہر حال میں ایڈمٹ کر لینا تھا۔ وقت اور پیسوں کے ضیاع کے علاوہ اور کوئی فائدہ نہ ہوتا دِل کی حالت جو، اب ہے وہی تب بھی رہنی تھی۔''

ہم نے اُسے باتوں سے روکا تو اُس نے کہا کہ اس وقت مجھے کوئی گھبراہٹ وغیرہ نہیں ہے۔ یہ کہہ کر وہ واش روم چلا گیا وہ جب نہا کر اور کپڑے بدل کر بیڈ پر لیٹ گیا تو میں نے کنول مشتاق سے کہا آپ نے تو کانفرنس کے انتظامات کرنے ہیں۔ ابھی اگلا سیشن شروع ہوگا۔ آپ جا کر انتظامات میں ہاتھ بٹائیں۔ میں ندیم کی دیکھ بھال کے لیے یہیں اس کے پاس رہوں گا۔

لیکن وہ ندیم کو اکیلا چھوڑ کر نہیں جانا چاہتے تھے۔ ندیم نے بھی کہا کہ اب وہ نارمل حالت میں ہے کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں ہے۔ وہ اپنی دوسری ذمہ داریاں نبھائیں۔ ندیم کی بات سن کر وہ کانفرنس ہال کی طرف چلے گئے۔

وہ ابھی دروازے سے باہر ہی نکلے ہوں گے کہ جاوید پنچھی اور سلطان کھاروی ندیم کا پتہ لینے آ پہنچے۔

''ہمیں جب پتہ چلا کہ ندیم صاحب کو چکر آ گیا ہے اور انہیں ایمرجنسی لے گئے ہیں تو ہم نے پتہ کیا کہ کون سے ہسپتال گئے ہیں۔ ہمیں بڑی مشکل سے پتہ چلا کہ ہسپتال کی بجائے ہوٹل میں ہیں۔ ہم اُسی وقت رکشہ لے کر چل پڑے کسی قسم کی مدد کی ضرورت ہے تو بتائیں، سلطان کھاروی نے کہا۔

''میں نے ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ کسی قسم کی مدد کی ضرورت نہیں ندیم اب تندرست ہے۔

سلطان کھاروی نے یہ بھی پیش کش کی کہ میں پرمار صاحب کی دیکھ بھال کے

لیےاُن کے پاس بیٹھتا ہوں۔آپ کانفرنس اٹینڈ کر آئیں۔

''آپ بھی تو ہماری طرح لاہور میں مہمان ہیں۔لکھاری کے ساتھ ساتھ صحافی بھی ہیں۔کانفرنس اٹینڈ کرنا آپ کے لیے زیادہ ضروری ہے۔اگر میں سیشن نہ بھی اٹینڈ کرسکا تو کوئی بات نہیں۔آپ کل مجھے اس سیشن کی رپورٹ دے دیں۔''میں نے اُن سے گزارش کی۔

کچھ دیر وہ بیٹھے۔ندیم کے یاد دلانے پر کہ وہ کانفرنس سے لیٹ ہورہے ہیں، دونوں کانفرنس ہال کی طرف چلے گئے۔اُن کا ہوٹل آ کر ندیم کی خبر گیری کرنا ہمیں اُن کا شکرگزار بنا گیا۔

ندیم کو نیند آ گئی اور میں یہاں کے دو تین اخباروں جو ہمیں ہوٹل والوں کی طرف سے بھی ملے تھے اور ہم نے خود بھی خریدے تھے، کا جائزہ لینے لگا۔اس کانفرنس کی شہرت بہت تھی۔شہر میں جگہ جگہ کانفرنس سے متعلق پوسٹر لگے ہوئے تھے۔کانفرنس کی بہت کوریج ہورہی ہے لیکن کسی بھی اخبار کے پہلے صفحے پر کانفرنس کی خبر نہ تھی اخبارات کے اندرونی صفحات میں خبر لگی تھی۔وہ بھی صبح کے سیشن کی۔شام کے سیشن کی خبر کسی جگہ بھی نہ تھی۔اُردو اخبارات نے تو اور بھی کم خبریں لگائی تھیں۔انگریزی اخبار نیوز انٹرنیشنل نے خبر تو موٹی سرخی لگا کر اندرونی صفحے پر لگائی تھی مگر اُس میں بھی صرف تین نمایاں حضرات،فخر زمان جی،سابق صدر رفیق تارڑ جی اور ترلوچن سنگھ جی کی تقریروں کے ہی اقتباسات دیے تھے۔یہاں یہ عام خبر تھی کہ یہ پنجابی کانفرنس اُردو پر حملہ ہے۔اُردو کے مدعی ایسی کانفرنسوں سے خوش نہیں لگتے تھے۔

کانفرنس کے اس سیشن کا عنوان تھا''زبانیں دنیا کی نظر میں''ہم دونوں تو یہ سیشن اٹینڈ نہ کر سکے لیکن ہمیں رپورٹ یہ ملی کہ اس سیشن میں بھی دونوں ملکوں کے میل جول اور پنجابی زبان کی ترقی کے عمل پر ہی بات چلی۔

شام کے چھ بجے لکھاری سیشن سے فارغ ہوئے تو ندیم کے یار دوست اس کی

طبیعت کا پتہ کرنے ہمارے کمرے میں آنے لگے۔ سب سے پہلے ''روزنامہ چوائس'' کے ایڈیٹر احمد یار جنجوعہ اور بچوں کے میگزین ''پکھیرو'' کے ایڈیٹر اشرف سہیل آئے۔ ندیم پرمار نے اپنے ناول ''چٹی موت'' کو چھاپنے کے حقوق احمد یار جنجوعہ کو دیے ہوئے تھے۔ اُن سے معلوم ہوا کہ یہ ناول شاہ مکھی میں پرنٹ تو کیا جا چکا ہے لیکن ابھی کتابی صورت میں نہیں چھپا۔ ندیم کی صحت یابی پر مبارک باد اور اسے دوبارہ بیمار نہ ہونے کی دُعا دے کر احمد یار جنجوعہ تو گھنٹہ بھر بعد چلے گئے جبکہ اشرف سہیل یہاں سے چھپنے والے پنجابی رسالوں کے متعلق بتانے لگے۔ اُن کے خیال میں پنجابی رسالے خاص کر بچوں کے رسالے چھاپنا گھر جلا کر تماشا دیکھنے والی بات ہے۔ اُن کی گفتگو میں ایک سنجیدہ ایڈیٹر کی جھلک دکھائی دے رہی تھی۔

اُن سے بات چیت جاری تھی کہ کئی اور دوست بھی کمرے میں آ گئے۔ اُن میں کنول مشتاق، جاوید پنچھی، عاشق علی فیصل شامل تھے۔ کمرہ لکھاریوں سے بھر گیا۔ ندیم کو نو برنو دیکھ کر کنول مشتاق نے کہا کہ رات والا کلچرل پروگرام ضرور اٹینڈ کرنا ہے۔ وہ کچھ دیر بیٹھ کر اپنے ساتھیوں کے ہمراہ کلچرل پروگرام کے بندوبست کے لیے چلے گئے۔ جب کہ باقی دوست بیٹھے رہے اور پاکستان کے پنجابی لکھاریوں اور صحافیوں کی باتیں ہونے لگیں۔ اُن میں سے کچھ کا خیال تھا کہ کچھ لوگ تو میگزین اور اخبار اپنے شوق یا پنجابی سے پیار کی وجہ سے چھاپتے ہیں اور اپنی ساری کمائی ان پر ہی خرچ کر جاتے ہیں۔ کچھ لوگ پیسے کمانے کے لیے پرچے چھاپتے ہیں۔ ان پرچوں سے ویسے تو کوئی بچت ہوتی نہیں لیکن ان کی آڑ میں کئی اور دھندے کرتے ہیں۔ اگر کوئی کسی کی غیبت کرتا تو ہماری طرف سے ہاں میں ہاں بھی نہ ملائی جاتی کیونکہ ہمارے لیے تو سارے ہی قابل احترام تھے۔ یہ سب ہماری عزت افزائی کر رہے تھے اور ہم نے تو اپنے ساتھ کسی کی جانب سے بھی امتیازی سلوک نہیں دیکھا تھا۔ البتہ وہاں کے لوگوں کے اپنے اپنے مسئلے ہوں گے ویسے کہیں بھی حسد، بغض اور ٹانگ کھینچنے والوں کی کمی تو ہوتی نہیں۔ مشرقی پنجاب یا کینیڈا، امریکہ میں کون سی ٹانگ کھینچنے

والوں کی کمی ہے۔

جب احمد یار جنجوعہ اپنے کیمرہ مین کو ساتھ لے کر آ گیا تو کچھ لکھاری اور ایڈیٹر اُٹھ کر چلے گئے۔ ان میں سے بعض کی رائے جنجوعہ کے متعلق کچھ زیادہ اچھی نہ تھی۔ جنجوعہ اپنے ساتھ اپنے روزنامہ اخبار چوائس کی دو دو کاپیاں لے آیا۔ یہ اُردو کا دو چار صفحوں کا اخبار تھا۔ آج کے اخبار میں کانفرنس کے متعلق ایک بھی سطر نہ تھی۔ حالانکہ کانفرنس کو شروع ہوئے آج تیسرا دِن تھا اور لاہور میں خبروں کے دو ہی موضوع حاوی تھے۔ انڈین وزیرِاعظم جناب من موہن سنگھ اور پاکستانی صدر جنرل مشرف کی ملاقات اور بارہویں عالمی پنجابی کانفرنس۔

جنجوعہ کے کیمرہ مین نے ہمارے الگ الگ فوٹو لیے اور جنجوعہ کے ساتھ انٹرویو کے دوران بھی فوٹو لیے گئے۔ انٹرویو کے بعد ایک گروپ فوٹو بھی لیا گیا۔ اگلے دِن کے اخبار میں یہ فوٹو چھپے بھی اور جنجوعہ نے اخبار کی کاپیاں اور فوٹو ہمیں بھیجے بھی۔

اس کارروائی کے بعد ہم کلچرل پروگرام میں شرکت کے لیے تیار ہونے لگے تو جنجوعہ زور دینے لگا کہ ہم اُس کے اخبار کے دفتر کا چکر ضرور لگائیں اور اُس کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار بھی کریں جو کہ اس انٹرویو کے ساتھ ہی شائع کیا جائے گا۔ ہم نے ہاں نہ کی درمیانی کیفیت میں تھے کہ کیا جواب دیں۔ اشرف سہیل کا کہنا تھا کہ ندیم صاحب کی صحت کو دیکھتے ہوئے ان کے لیے اتنی سیڑھیاں چڑھنا کافی مشکل ہوگا۔ اس لیے دفتر نہیں جانا چاہیے لیکن جنجوعہ ضد کیے بیٹھا تھا۔ ''میں نے آپ کو دفتر ضرور لے کر جانا ہے۔''

ہم نے سوچا کہ کلچرل پروگرام تو رات کے نو بجے ہی شروع ہوگا۔ کیوں نہ دفتر دیکھ ہی لیا جائے۔ پتہ لگ جائے گا کہ اُردو اخبار کیسے شائع ہوتے ہیں۔ کینیڈا جا کر بتانے والی نئی بات ہی ہوگی۔

اشرف سہیل کے ساتھ ہم آٹو رکشہ میں بیٹھ کر اُس کے دفتر گئے جنجوعہ خود موٹر سائیکل پر ہمارے آگے آگے تھا۔ آٹو کا کرایہ اشرف سہیل نے ادا کیا۔ اخبار کا دفتر

ایبٹ روڈ لاہور کی ایک پرانی عمارت کی چوتھی منزل پر تھا اور اوپر جانے کے لیے صرف سیڑھیوں کا راستہ تھا۔ سیڑھیاں بھی اندھیرے میں تھیں، روشنی بالکل نہ تھی ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے سیڑھیوں پر پیر ٹکاتے اور رُک کر سانس لیتے ہوئے بڑی مشکل سے جنجوعہ کے دفتر پہنچے۔ ندیم کا تو پتہ نہیں کیا حال ہوا ہوگا لیکن میرا پانچ منٹ تک سانس میں سانس نہ رہا۔ ندیم بھی کچھ دیر سر جھکائے بیٹھا رہا۔ جنجوعہ نے ہمیں مینگو جوس کے ڈبے پلائے۔ جوس پی کر دل کو کچھ سکون ملا۔ پھر ہم اُس کے اخبار کی اشاعت کا عمل دیکھنے لگے۔

ایک بڑا کمرہ تین حصوں میں منقسم تھا۔ ایک حصے میں جنجوعہ کا دفتر تھا اور دوسرے حصے میں اسسٹنٹ ایڈیٹر کا۔ ان دو دفتروں نے کمرے کا آدھا حصہ گھیرا ہوا تھا۔ باقی آدھے حصے میں میزوں پر دو تین کمپیوٹر رکھے ہوئے تھے۔ ایک جگہ کالم نویس بیٹھا اخبار کے لیے کچھ لکھ رہا تھا۔ دو کارکن پیسٹنگ کر رہے تھے۔ اخبار کی چھپائی کہیں دوسری جگہ سے ہوتی تھی۔ اخبار بڑے سائز کے چار صفحات پر ہی چھپتا تھا۔ عالمی خبروں کے ساتھ لوکل خبریں زیادہ تھیں۔ تقریباً پانچ منٹ ہم اخبار کو چھپائی کے لیے تیار ہوتا دیکھتے رہے۔ پھر جنجوعہ ہمیں بلڈنگ کی اوپر والی منزل پر لے گیا۔ یہاں سے لاہور کا دور دور تک نظارہ کیا جا سکتا تھا۔ اونچی اونچی عمارتوں میں روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ چاروں طرف رنگ برنگی روشنیوں کا نظارہ عجیب ہی سماں باندھ رہا تھا۔ ایک طرف ریلوے سٹیشن کی جگمگاہٹ تھی۔ اُس کے پاس ہی پریس کلب کی عمارت روشن تھی۔ قریب ہی ٹی۔ وی سٹیشن اور ریڈیو سٹیشن کی عمارتیں چمک رہی تھیں۔ سڑک کے کھمبوں کی قطار اندر قطار روشنیاں، سڑکوں پر جھلملاتی کاروں، بسوں کی بھیڑ اور سڑکوں کے چوراہوں میں جلتی بجھتی ٹریفک سگنلز کی لال ہری بتیوں نے سیڑھیاں چڑھتے وقت ہوئی کوفت کی کڑواہٹ غائب کر دی۔ دل نے جنجوعہ کا شکریہ ادا کیا کہ اگر وہ یہاں نہ لاتا تو بلندی سے لاہور کا نظارہ کبھی نہ کیا جا سکتا۔ چنانچہ یہ نظارہ دکھانے پر اشرف سہیل اور جنجوعہ کا دوبارہ شکریہ ادا کر کے ہم نیچے اُتر آئے اور آٹو رکشہ لے کر الحمرا ہال پہنچ گئے۔ کرایہ اس بار بھی اشرف سہیل نے ہی دیا۔

نو بج رہے تھے۔ کھانا شروع نہیں ہوا تھا۔ کلچرل پروگرام کھانے کے بعد ہی شروع ہونا تھا۔ سارے تماشائی اور مہمان اِدھر اُدھر وقت گزاری میں مصروف تھے۔ ہمیں اپنی کوچ کا ڈرائیور یار محمد مل گیا۔ اُس کے ساتھ ہماری اچھی دوستی ہوگئی تھی۔ اُسے ندیم کی بیماری کا بھی پتہ چل چکا تھا۔ وہ مزاج پرسی کے لیے دِن کے وقت ہمارے کمرے میں گیا بھی تھا۔ یار محمد دو کرسیاں اُٹھالایا اور ہم کرسیوں پر دراز ہو گئے۔ ندیم اب پھر اپنی صحت کے متعلق کچھ فکرمند محسوس ہو رہا تھا۔ مجھے بھی فکر لگ گئی کہ یہ پروگرام کہیں مِس نہ کر بیٹھیں لیکن ندیم کہنے لگا اتنی زیادہ پریشانی کی بات بھی نہیں لیکن میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔

76 سالہ ڈاکٹر غلام حسین جو نیوجرسی سے تشریف لائے تھے اور جنہوں نے صدارتی پینل والی میری تقریر کی تعریف کی تھی، ہمارے پاس آئے اُن کے لیے یار محمد ایک اور کرسی لے آیا۔ شمالی امریکہ سے ہونے کی وجہ سے اُن کے ساتھ اچھی واقفیت ہو چکی تھی۔ وہ ہمارے ساتھ محوِ گفتگو ہو گئے۔ انہوں نے بتایا کہ اُن کا جنم تو انڈین پنجاب میں ہوا تھا مگر کالج کی تعلیم لاہور سے حاصل کی۔ کالج میں ہی تھے کہ تقسیم ہوگئی۔ خاندان اُجڑ کر لاہور آ نا بسا۔ اُجاڑے کے وقت بہت دکھ سہے مگر سب تکلیفیں بھلا کر امن اور دوستی کا پرچار کیا۔ امن کی تحریک سے تو کالج میں ہی جڑ گئے تھے۔ ایم۔ایس۔سی کر کے لاہور میں ہی پروفیسر لگ گئے۔ پاکستان میں امن کی تحریک کا سلسلہ کمزور تھا پھر بھی آگے بڑھ کر جدوجہد کی۔ کچھ عرصہ کالج میں پڑھانے کے بعد امریکہ میں پی۔ایچ۔ڈی کرنے آ گئے۔ پی۔ایچ۔ڈی کے بعد پھر واپس لاہور آ کر میڈیکل کالج میں پروفیسر لگ گئے۔ ساتھ ساتھ امن اور دوستی کا پرچار بھی کرتے رہے۔ ریٹائر ہونے کے بعد بھی مشن کے لیے کئی ملکوں کا دورہ کیا۔ اس مہم میں بہت رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا مگر اپنے راستے سے پیچھے نہ ہٹے۔ آج کل نیوجرسی امریکہ میں اپنے بچوں کے پاس رہتے ہیں لیکن زیادہ وقت مختلف ممالک میں جنگ مخالف لیکچرز دینے میں صرف کرتے ہیں۔ انڈین حکومت کی جانب سے انہیں دس سال کے لیے ملٹی پل ویزا مل چکا ہے۔ امریکہ اور پاکستان کی دوہری شہریت کے حامل ہیں۔

اُن کے ساتھ بات چیت کر کے دِل کو بڑی تسکین ہوئی کہ دنیا میں ایسے لوگ بھی بستے ہیں جن کا ایک ہی مقصد ساری دنیا کے لیے سکھ اور شانتی تلاش کرنا ہے۔ بڑھتی عمر بھی اُن کے راستے کی رکاوٹ نہیں بنی۔

یہیں بیٹھے بیٹھے پاکستانی پنجابی شاعر سلیم شہزاد مل گئے۔ انہوں نے اپنی شاعری کی کتاب ''بینرے سکن کاں'' کی ایک ایک کاپی ہمیں عنائت کی۔ خوبصورت جلد والی یہ کتاب دونوں رسم الخطوں میں چھپی تھی۔ اُن کا دونوں رسم الخطوں میں کتاب چھپوانا بہت ہی لائق تحسین قدم تھا۔ ہم نے اس پر اُن کو مبارک باد دی اور خواہش ظاہر کی کہ کہیں ہماری کتابیں بھی شاہ مکھی میں چھپ جائیں۔ ساڑھے نو بج گئے۔ کھانے کا بلاوا ابھی بھی نہ آیا تھا۔ ندیم اُکتاہٹ سی محسوس کر رہا تھا۔ اس دوران نثار احمد چودھری (سنی) کلچرل پروگرام دیکھنے آ گیا۔ اُسے دیکھ کر ندیم کہنے لگا ''سیکھا'' تم کھانا کھا کر ثقافتی پروگرام اٹینڈ کر لینا۔ میں کھانا کھانے کی بجائے ہوٹل جا کر آرام کروں گا۔ میری صحت کہیں پھر نہ بگڑ جائے سیڑھیاں چڑھنے کی وجہ سے جسم پھر بے آرامی سی محسوس کر رہا ہے۔

چودھری صاحب کہنے لگے ''آپ کھانا کھالیں میں ہوٹل میں آپ کو چھوڑ آؤں گا۔''

پونے دس بجے کے قریب کھانے کا بلاوا آ گیا۔ پنڈال میں جانے کے لیے بڑی احتیاط برتی جا رہی تھی۔ پولیس کی چیکنگ کے بعد ہی اندر جانا ممکن تھا۔ سب سے پہلے غیر ملکی شرکاء کو کھانے کے لیے پنڈال میں بھیجا گیا۔ پھر دوسرے شرکاء اور کارکنوں کو اندر جانے دیا گیا۔ ثقافتی پروگرام دیکھنے کے لیے آئے لوگوں کے رش کو دیکھتے ہوئے پولیس کانفرنس سے متعلقہ لوگوں کو ہی اندر جانے دے رہی تھی۔ میں سادا سا کھانا کھا کر پنڈال سے باہر آ گیا۔ ندیم کو میں اکیلا نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ اس لیے سنی چودھری کی وین میں ہم دونوں واپس ہوٹل آ گئے۔ سنی صاحب نے ہمارے موبائل کے لیے سم کارڈ لے لیا تھا۔ اب ہمیں یہاں سے باہر فون کرنے کی سہولت مل گئی تھی۔ ہم نے سنی کے فون سے اپنے گھر والوں کو اپنے

موبائل کا نمبر لکھوادیا۔سنی چودھری صبح ملنے کا وعدہ کر کے واپس چلا گیا۔

کل شوکت علی نے کہا تھا ''نئے گیت کے بول میں آپ کو سٹیج پر ہی سناؤں گا اور یہ گیت آپ کے نام ہوگا۔''

شوکت علی کا نیا گیت اُس کے سامنے بیٹھ کر سننے کی خواہش ادھوری ہی رہ گئی تھی۔



مصروفیت بھرا دن

ندیم پر مار کو رات خوب نیند آئی۔ صبح چھ بجے اُٹھتے ہی کہنے لگا ''سیکھا آج میں نو برنو ہوں۔''

''بہت اچھی بات ہے اگر نو برنو ہوتو۔'' میں نے اتنا ہی کہا، میں نے یہ نہیں کہا کہ بھلے آدمی، اگر رات کو بھی نو برنو رہتے تو پاکستانی ثقافت کی جھلک سے تو محروم نہ رہتے۔ ندیم اُٹھ کر ''یوگا'' کرنے لگا۔ اُس کے چہرے کی رونق دیکھ کر لگا کہ آج دِن خوب گزرے گا۔ ہم نے ابھی نہا کر کپڑے ہی بدلے تھے کہ جاوید پنچھی جی کی ٹکون اندر آ گئی۔ جب سے ہماری ان سے ملاقات ہوئی تھی یہ اکٹھے ہی ملتے تھے۔ پہلے انہوں نے اپنے متعلق زیادہ نہیں بتایا تھا لیکن آج تفصیل سے بتایا اور اپنی نظمیں بھی سنائیں۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے عاشق علی فیصل ''رویل'' میگزین کے ادارتی بورڈ میں شامل رہے ہیں اور رویل اکیڈمی کے چیئرمین بھی ہیں۔ جڑانوالہ میں رہتے ہیں۔ انہوں نے اپنی کچھ غزلیں بھی سنائیں۔ میں نے کچھ شعر نوٹ کر لیے، مثلاً:

میں اپنے گھر وچ بھلا کیوں ڈر گیا واں
میں اک قطرہ بھاویں، سمندر بھر گیا واں

اوہ سورج وانگراں سی میں اصلوں ٹھر گیا واں

میں جینا چاہ رہیا واں میں تاہیوں مر گیا واں

غزل میں خیال کی اڑان غضب کی تھی۔ میں نے ایک غزل کی فرمائش کی تو انہوں نے اپنی یہ غزل سنائی جس کے چند شعر درج ذیل ہیں:

میں تیرا کیہ لیا اے، میں تیرا ناں ای لیا اے

سی اپنی اگ اندر، میں سورج پی لیا اے

میں سکھ ونڈا اک دِن، میں صدمہ پی لیا اے

مرن دے شوق اندر بڑا چر جی لیا اے

سلطان کھاروی اور جاوید پنچھی نے اپنی ایک ایک دو دو نظمیں سنائیں جو کہ نوٹ نہ ہو سکیں۔ اب اس بات کا افسوس ہے کہ ہم منی کیسٹ ریکارڈر ساتھ لے کر بھی گے مگر پاکستانی لکھاریوں اور صحافیوں کی گفتگو ریکارڈ بھی نہ کر سکے۔

ان کی نظمیں اور غزلیں سن کر اس تکون کی شاعرانہ دردمندی من میں اور بھی جا گزیں ہوگئی۔ کانفرنس کے دوران ہمارے ساتھ سب سے زیادہ میل اس تکون کا ہی رہا۔ کچھ اور ساتھی آ گئے تو وہ اُٹھ کر چلے گئے جیسے اُن کا معمول ہی بن گیا ہو کہ وہ روزانہ سب سے پہلے ہمیں ملنے آتے اور ہم سے گفتگو کرتے۔ جب کوئی اور ساتھی آ جاتا تو وہ کمرے سے اُٹھ کر چلے جاتے۔ ایسا لگتا تھا جیسے کمرے میں بھیڑ اور دوسروں کی ملاقات میں دخل اندازی انہیں ناپسند ہو۔ بلاشبہ پہلے دِن انہوں نے کینیڈا میں اپنے رسالوں کی خریداری کی بات چلائی تھی لیکن بعد میں دوبارہ بات نہیں کی۔ اس لیے انہوں نے ہمارے اوپر اپنی اپنی شخصیت کا اچھا تاثر چھوڑا اور نئی دوستی کی بنیاد بھی رکھی۔

نئے آئے ساتھیوں کو میں غور سے دیکھتا رہا کہ ان سے پہلے بھی ملاقات ہے یا آج ہی آئے ہیں۔ لباس سے کسی کی جلد پہچان مشکل تھی۔ اس طرح کی کانفرنس میں جب آپ بہت سے نئے چہروں کو دیکھتے ہیں اور اُن سے چند رسمی جملوں کا تبادلہ کر کے آگے بڑھ

جاتے ہیں تو دوسری مرتبہ ملتے وقت یاداشت میں نہ ہونے کی وجہ سے بڑی مشکل پیش آتی ہے۔ انسان کا لباس بھی اُس کی پہچان کا باعث ہوتا ہے لیکن جیسا کہ پہلے بتایا جاچکا ہے۔ یہاں صدر سے لے کر چپڑاسی تک سب کا ایک ہی لباس ہے، شلوار قمیص۔ جب تک آپ تسلی سے بیٹھ کر کسی کے ساتھ چار باتیں نہیں کر لیتے آپ اُس کے مرتبے سے واقف نہیں ہو سکتے۔ کانفرنس میں فخر زمان جی اور وہاں پانی پلانے والے شخص کا لباس ایک ہی جیسا تھا اگر چہ کپڑے کی قیمت میں فرق ضرور تھا۔ لباس کی اہمیت کے متعلق ایک اور وجہ بھی اہم ہے وہ ہے ہماری غلام ذہنیت، ہمارے دماغوں میں زرق برق اور انگریزی لباس کوٹ پینٹ ہی بڑائی کی علامت کے طور پر نقش ہے۔ اس لیے سادا لباس والے کو ہماری عقل بڑا آدمی سمجھنے سے ہچکچاتی ہے۔ پاکستانی لوگوں نے ایک ہی قسم کا لباس پہن کر ایک معرکے کا کام کیا ہے۔

انگریزوں سے آزاد ہوئے 58 سال بیت گئے مگر ہمارے ذہنوں سے اُن کے لباس کا احساسِ برتری نہ نکل سکا۔ جو کہ پاکستانی بھائیوں نے نکال پھینکا ہے۔

نئے متر پیاروں سے مل کر ہم سب کوچ میں بیٹھنے کے لیے نیچے آ گئے نیچے لاونج میں باقی شرکاء پہلے ہی موجود تھے۔ اُن سے رات کے ثقافتی پروگرام کے متعلق گفتگو ہوئی۔ ہردیو وڑائچ نے بتایا کہ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور پاکستانی فنکاروں کی پرفارمنس کمال تھی۔ پروگرام کی تعریف سن کر دِل میں ہوک سی اُٹھی '' کاش یہ پروگرام ہم نے بھی دیکھا ہوتا لیکن جو بیت گیا سو بیت گیا۔ اب اُس پر پچھتانا کیا۔

آج کا دِن بہت مصروفیت بھرا تھا۔ راوی ٹی۔ وی چینل والوں نے ہمیں اپنے سٹوڈیو آنے کی دعوت دے رکھی تھی۔ آج سہ پہر کو ٹی۔ وی انٹرویو کے لیے جانا تھا۔ پروفیسر عاشق رحیل نے بھی شام سات بجے ایک مشاعرے میں لے کر جانا تھا۔ ندیم نے جانے کا وعدہ کر رکھا تھا۔ اس لیے ندیم صبح سے ہی اپنی صحت کے متعلق محتاط تھا اُس نے ناشتہ بہت ہلکا کیا تھا۔ زیادہ چل پھر بھی نہیں رہا تھا۔ ہم کوچ سے اُتر کر سیدھے کانفرنس ہال میں چلے گئے۔

آج کے پہلے سیشن کا عنوان تھا ''امن، بھارت اور پاکستان کے درمیاں ایک پل''آج کا صدارتی پینل چھوٹا تھا جس میں ڈاکٹر نظام الدین، جناب فخر زمان، دلی سے محترمہ فاطمہ حسین ڈاکٹر عالیہ امام، انگلینڈ سے جناب عزیز مظہر اور جناب سعید اللہ چودھری۔

سب سے پہلے جناب سعید اللہ چودھری نے اپنی تقریر میں انڈو پاک تعلقات کی بات کرتے ہوئے کہا کہ اگر دونوں ملکوں کے عوام کے تعلقات اچھے ہوں گے تو دونوں ملکوں کے حکمرانوں کو بھی اپنے تعلقات اچھے کرنے پڑیں گے۔ اس طرح کی کانفرنسیں اچھے تعلقات بنانے میں مددگار ثابت ہوتی ہیں۔ یہ سلسلہ جاری رہنا چاہیے۔

انہوں نے تجارت کی بات کرتے ہوئے کہا کہ دونوں ملکوں کے بیچ سمگلروں کے ذریعے دوارب کی تجارت ہوتی ہے جو کہ دونوں ملکوں کے جوڑوں میں تیل ڈال رہی ہے۔ پھر یہ دونوں ملک صحیح طور سے تجارت کیوں نہیں کرتے۔ دونوں ملکوں کو چاہیے کہ اپنے بیوپار کو فروغ دیں۔ خاص طور پر زرعی آلات کا تبادلہ کرنا چاہیے۔ اس طریقے سے دونوں ملکوں کو مالی فائدہ بھی ہوگا اور چیزوں کی قیمت بھی کم ہوگی۔

دلی سے تشریف لائی ڈاکٹر فاطمہ حسین نے اپنی گفتگو پنجاب میں صوفیاء کے رول سے شروع کی۔ صوفیاء نے بولی، سماج اور کلچر پر بہت اثر ڈالا تھا۔ ان صوفیاء نے ہی امن کی بات کرنا شروع کی تھی۔ یہ صوفیاء کا ہی اعجاز تھا کہ انہوں نے ہندو ثقافت اور مسلم ثقافت میں فاصلے کم کیے۔ آج بھی ہمیں ان صوفیاء سے راہنمائی حاصل کرنا چاہیے۔

انگلینڈ سے تشریف لائے جناب عزیز مظہر نے اپنے خطاب میں کہا کہ دونوں ملکوں میں دوستی اور بھائی چارہ قائم رہنا چاہیے اسی طریقے سے دونوں ملک ترقی کر سکیں گے۔ جنگوں سے کبھی کسی قوم نے کچھ حاصل نہیں کیا۔ اس لیے ایک دوسرے کے جذبات کو سمجھتے ہوئے ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر امن کے راستے پر چلنا چاہیے۔ اس میں عوام اور حکمرانوں کا بھلا ہے۔

محترمہ عالیہ امام نے اپنی دھڑلے دار تقریر میں کہا کہ آج کا دور سائنس کی ترقی

کا دور ہے، کتنے دکھ کی بات ہے کہ سائنس کی ترقی کو جوڑنے کے بجائے توڑنے کے کام میں لایا جارہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا تباہی کی طرف بڑھ رہی ہے۔ اگر سائنسی ترقی توڑنے کے کام آتی رہی تو دنیا سے انسان کا نام ونشان مٹ جائے گا۔ ان توڑنے والی طاقتوں کو مجبور کر دینا چاہیے کہ سائنسی ترقی کو جوڑنے کے عمل میں لگائیں۔ صرف پاک بھارت کو ہی امن کی ضرورت نہیں بلکہ امن کی ضرورت سارے سنسار کو ہے۔ جنگ دنیا کے کسی بھی کونے میں ہو اُس کی تپش ان دونوں ملکوں کو لگے گی۔ دونوں ملکوں کو اپنے لیے امن کی ضرورت تو ہے ہی انہیں باقی دنیا میں امن کے لیے بھی جدوجہد کرنی چاہیے۔

جنگوں کے تانے بانے کو اس طرح کی عالمی کانفرنسیں توڑنے میں مددگار ثابت ہوتی ہیں اکیلا آدمی بھی جنگوں کے جبر کے خلاف لڑسکتا ہے۔ صرف ثابت قدمی اور حوصلے کی ضرورت ہے۔ لوگ خود بخود پیچھے چل پڑیں گے۔

امن کی باتیں کی تو جاتی ہیں لیکن امن کے اصل مطلب کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی جاتی۔ دہشت گردی امن کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے۔ جب تک دہشت گردی کی حوصلہ افزائی ہوتی رہے گی۔ اُس وقت تک کہیں بھی امن نہیں ہوگا۔ شدت پسند مذہبیت بھی امن کے لیے خطرناک ہوتی ہے۔ اس لیے شدت پسند مذہبیت کا نقاب اُتارنا پڑے گا۔

فخر زمان جی کانگریس کے چیئرمین ہونے کے کارن ہر سیشن کے صدارتی پینل میں نمایاں ہوتے تھے۔ انہوں خطاب بھی کرنا ہوتا تھا۔ مگر اُن کی تقریر کی خوبی یہ کہ ہر تقریر نئی ہوتی تھی، تقریروں میں باتیں دہرائی نہیں جاتی تھیں۔ انہوں نے کہا کہ دانشور حکومتوں کو راس نہیں آتے۔ حکومتیں دانشوروں کو خرید لیتی ہیں۔ جب دانشور بک جاتا ہے تو وہ دانشور نہیں رہتا۔ دانشور ہی تاریخ بناتے ہیں۔ اس لیے دانشوروں کو اپنی دانش کو گروی رکھنے سے گریز کرنا چاہیے اور محتاط رہنا چاہیے کہ کہیں اُنہیں خریدا تو نہیں جارہا۔ فن برائے فن کا نعرہ بکواس ہے۔ کوئی فن صرف فن کے لیے نہیں ہوتا۔ فن صرف اور صرف زندگی کے لیے ہوتا ہے۔ اس لیے فن کو زندگی کے لیے وقف ہونا چاہیے جب کوئی فن کار حاکموں سے تمغہ لیتا

ہے تو پھر وہ فن کار نہیں رہتا، چاہے وہ کتنا ہی بڑا فن کار کیوں نہ ہو۔ یہاں پر انہوں نے فیض کی مثال دی جنہیں کال کوٹھڑی میں ڈال دیا گیا تھا مگر انہوں نے کرسی کے لیے سمجھوتہ نہ کیا۔

انہوں نے پنجابی میں نئے الفاظ کی آمد کی بات کرتے ہوئے کہا کہ زندہ دماغوں کو نئے الفاظ کی ضرورت ہوتی ہے اور اُن میں لفظ آتے بھی ہیں۔ پنجابی زبان میں بھی نئے نئے لفظ آئیں گے۔ لکھاریوں کو پنجابی زبان کے ہاضمے کو دھیان میں رکھتے ہوئے نئی نئی علامتیں اور نئے نئے الفاظ تراشنے چاہئیں۔

آخر میں انہوں نے کہا کہ تاریخ میں زندہ رہنے کے لیے تاریخ کے ساتھ ساتھ چلنے کی بجائے تاریخ کو اپنے ساتھ لے کر چلنا چاہیے۔

سب سے آخر میں ڈاکٹر نظام الدین نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا ''آج وقت ہے دونوں ملکوں کو اپنے سیاسی اور معاشی مسئلے مل کر حل کر لینے چاہئیں۔ اگر انہوں نے یہ وقت بھی گنوا لیا تو پھر ان کے پاس پچھتانے کے سوا کوئی چارہ نہ ہوگا۔

دونوں ملکوں کی آبادی میں اضافہ دونوں ملکوں کی غریبی میں اضافہ کرتا جا رہا ہے۔ دونوں ملکوں کو ہی اپنی آبادی میں اضافے پر تشویش ہونی چاہیے۔ آبادی کا بم ایٹمی بموں سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ اس لیے اس مسئلے پر فوری توجہ کی ضرورت ہے۔

اگر دونوں ملک مل کر معاشی میدان میں تعاون کریں تو دنیا کی معاشی طاقت کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اگر یہ نہ سنبھلے تو عالمی منڈی میں دونوں ملکوں کا ہی کچومر نکل جائے گا۔ آخر میں انہوں نے کہا کہ دونوں ملکوں کو ہر شعبے میں تعاون کرنا چاہیے۔ اپنے تعلیمی ماہرین کا تبادلہ کرتے رہنا چاہیے۔ اس میں دونوں ملکوں کی عوام کا بھی بھلا ہے اور حکومتوں کا بھی۔''

سیشن ختم ہوتے ہی کھانے کے میدان کی طرف کوچ کیا۔ آج کھانے کے دوران ایک سادہ سے انسان سے ملاقات ہوئی جو پورے سنسار کا درد اپنے سینے میں لیے پھر رہا تھا۔ یہ انسان تھے جناب محمد ظہیر باجوہ، ویسے تو وہ ایک گیس اپلائینس کمپنی کے پروپرائیٹر تھے۔ وہ مذہبی پس منظر کے ہوتے ہوئے بھی مذہبی دیواروں سے بہت آگے نکل چکے تھے۔

وہ دونوں ملکوں کی تقسیم کو فطری تقسیم نہ مانتے ہوئے بھی اب اسے تسلیم کرتے تھے۔ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ اس تقسیم کے پیچھے انگریزوں کی چال تھی۔ جسے کامیاب بنانے میں ہمارے سیاستدانوں کا بڑا ہاتھ تھا۔آج کل وہ پاک بھارت دوستی کے لیے کام کر رہے ہیں۔

وہ اس بات کے متمنی تھے کہ انگریزوں سے آزادی حاصل کرتے ہوئے جو بھی شہید اپنی جانیں وار گئے وہ دونوں ملکوں کے سانجھے شہید ہیں۔

انہوں نے شہید بھگت کے آزادی کی جدوجہد میں بے مثال کردار، اُن کے انقلابی نظریات اور اُن کی عظیم شخصیت کے احترام میں اپنے بیٹے کا نام سردار علی بھگت سنگھ رکھا ہے۔اُس بچے کا جنم اس سال نہیں ہوا بلکہ بارہ سال قبل ۲ مارچ ۱۹۹۳ء کو ہوا تھا۔انہوں نے ہمیں اپنے بیٹے کے جنم سرٹیفکیٹ کی کاپی بھی دی۔ یہی نہیں بلکہ وہ گرمکھی سکرپٹ میں لکھی ہوئی پنجابی کی اچھی کتابوں کو شاہ مکھی میں کروا کر چھپوا بھی رہے ہیں تاکہ پنجابی کا زیادہ سے زیادہ پرچار ہو سکے اور مغربی پنجاب کے پنجابی پیارے مشرقی پنجاب کے ادب سے واقف ہو سکیں۔انہوں نے درشن سنگھ آوارہ کی پنجابی کتاب ’’بغاوت‘‘ کی ایک ایک کاپی ہمیں عنایت بھی کی۔اسی موقع پر ہماری ملاقات ’’دلا بھٹی اکیڈمی‘‘ کے سرپرست جناب بشیر حسین بھٹی سے ہوگئی۔انہوں نے دلا بھٹی کی یاد میں یہ تنظیم قائم کر رکھی ہے جو ہر سال پاکستان میں کسی نہ کسی مقام پر میلہ منعقد کرتی ہے۔دلا بھٹی وہ عظیم عوامی ہیرو تھا جس نے شہنشاہ اکبر کی سلطنت کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔بھٹی صاحب نے ہمیں دعوت دی کہ ہم اس ستمبر، اکتوبر میں منائے جارہے دلا بھٹی یادگاری میلے میں ضرور شرکت کریں۔انہوں نے کہا کہ آپ کا یہاں رہائش اور کھانے پینے کا خرچہ ہماری تنظیم کی طرف سے ہوگا۔صرف ہمیں وہاں پہنچنا ہوگا۔

وہ ہمیں میلے کے متعلق تفصیل سے بتا رہے تھے کہ راوی ٹی، وی کا پروڈیوسر گُرمیت ہمیں تلاش کرتا ہوا آ پہنچا۔وہ کل دوپہر کے وقت ہمیں تلاش کرتا رہا تھا۔سو ہم نے دلا بھٹی اکیڈمی کے سرپرست جناب بشیر بھٹی سے معذرت کرتے ہوئے رُخصت لی اور

پنڈال سے باہر آ گئے۔ اتنی دیر میں ڈاکٹر دیپک من موہن انڈیا سے اپنا وفد لے کر الحمرا کمپلیکس میں پہنچ گئے۔ مشرقی پنجاب سے بھارتی وفد کے کانفرنس میں شامل ہونے سے سب لوگ خوش تھے۔ اس وفد میں ڈاکٹر دیپک من موہن کے ساتھ فلم ڈائریکٹر سنیتا دھیر، ڈاکٹر روپندر کور، ڈاکٹر مسز ڈھلوں، ڈاکٹر جگبیر سنگھ کے بہو بیٹے اور دلی سے دوسر دار صاحبان بھی ساتھ شامل تھے۔ اس وفد کے ارکان سے ہمارا ملنا بہت ضروری تھا کیونکہ ڈاکٹر دیپک من موہن اور ڈاکٹر جگبیر جی ۲۰۰۳ء میں کینیڈا میں ہوئی پنجابی بولی کانفرنس میں شریک تھے۔ اب کینیڈا سے آ کر ندیم پر مار دلی میں ڈاکٹر جگبیر سنگھ جی کے پاس ہی ٹھہرا تھا۔ ہم نے گرمیت سنگھ سے پانچ منٹ کے لیے رُک جانے کا کہا۔ وہ لہراں میں کام کرنے والے کلیان سنگھ کلیان کے پاس چلا گیا کیونکہ وہ کلیان سنگھ کو اپنے ساتھ ٹی وی چینل پر لے جانا چاہتا تھا لیکن کلیان تو خود غیر ملکی شرکاء سے واقفیت پیدا کرتا ہوا دوستی کے سفر پر تھا۔ اُس نے گرمیت کے ساتھ جانے سے معذوری ظاہر کر دی۔ تقریباً دس منٹ بعد گرمیت ہمارے پاس آ گیا۔ اتنی دیر میں ہم دیپک جی سے اور شرکاء کے نہ آ سکنے کا سبب جان گئے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ اکثر دوستوں کا خیال تھا کہ ایک آدھ دن کے لیے ویزا کیوں لیا جائے۔

ہم آٹو رکشہ میں بیٹھ کر گرمیت کے ہمراہ راوی ٹی وی چینل کے دفتر پہنچ گئے۔ راوی ٹی وی کے مینجنگ ڈائریکٹر جناب وڑائچ صاحب بڑے تپاک سے ملے اور راوی ٹی وی سے تعاون پر ہمارا شکریہ ادا کیا۔ انہوں نے فوراً چائے منگوائی چائے آنے تک وہ ہمیں چینل کو درپیش مشکلات اور اس کی نشریات میں توسیع کے متعلق گفتگو کرتے رہے۔ اُن کی خواہش تھی کہ اس چینل کے پروگرام شمالی امریکہ سے بھی نشر کیے جائیں اور گرونانک کے جنم استھان ننکانہ صاحب سے ہر روز صبح کے وقت شبد کیرتن کا پروگرام براہِ راست نشر کیا جائے۔ اس سلسلے میں انہوں نے ہم سے مدد کی درخواست کی کہ ہم پتہ کر کے بتائیں کہ اس سلسلے میں روزر یا شاء کیبل والوں میں سے کس سے ڈیل کی جائے۔ ندیم نے کینیڈا پہنچ کر ساری معلومات لینے کے بعد اپنی رائے دینے کا وعدہ کیا۔

چاۓ پینے کے بعد ہمارے پروگرام کی ریکارڈنگ شروع ہوئی۔ ہمارا انٹرویو اگرچہ الگ الگ کیا گیا تھا لیکن سوال دونوں سے ملتے جلتے کیے گئے تھے۔ادبی حوالے کے علاوہ جو سوال کیے گئے وہ سوال تھے۔

- پاکستان آ کر آپ کیسا محسوس کر رہے ہیں۔
- دونوں ملکوں (انڈو پاک) میں میل جول کیسے بڑھایا جائے۔
- یہاں کے لوگوں کا آپ کے ساتھ رویہ کیسا رہا۔
- دونوں ملکوں میں پنجابی زبان کی حالت کیسی ہے۔
- کینیڈا میں پنجابی کی حالت کیسی ہے۔
- ان کانفرنسوں کا کوئی فائدہ بھی ہے یا نہیں۔
- پنجابی زبان لکھنے کے لیے کون سا رسم الخط سب سے اچھا ہے۔

ہم نے ٹو دی پوائنٹ جواب دیے جیسا کہ پاکستان میں آ کر ہمیں اجنبیت محسوس نہیں ہوئی۔ ایسے لگ رہا ہے جیسے کینیڈا سے ہم اپنے گھر آئے ہوں یہاں کے لوگوں سے بہت پیار ملا ہے۔ ہم سے بھائیوں جیسا سلوک کیا گیا ہے۔کانفرنس کا بنیادی موضوع امن دوستی اور پنجابی زبان کی ترقی تھا۔ یہ کانفرنس بہت اہم مسئلوں کے حل میں مدد فراہم کرتی ہیں۔ دونوں پنجابوں میں پنجابی زبان کی حالت کچھ زیادہ اچھی نہیں لیکن پنجابی سے پیار کرنے والے اسے مرنے نہیں دیں گے۔ پنجابی زبان ویسے تو کسی بھی رسم الخط میں لکھی جا سکتی ہے مگر اسے صحیح اور اس کی آوازوں کے مطابق لکھنے کے لیے گرمکھی رسم الخط ہی بہتر ہے۔ ندیم نے کہا کہ اگر زیر زبر لگا کر پنجابی کو شاہ مکھی میں لکھا جائے تو یہ ٹھیک ہے۔ میرا خیال تھا کہ زیر زبر کے ساتھ ساتھ شاہ مکھی کو ’’ن اور ل‘‘ کے لیے بھی علامتیں ڈھونڈنی پڑیں گی۔ چونکہ پاکستان میں پنجابی شاہ مکھی میں لکھی جاتی ہے اس لیے انٹرویور چاہتا تھا کہ ہم کہہ دیں کہ شاہ مکھی ہی بہتر ہے۔ گرمیت سنگھ کی ہمارے ساتھ ہوئی گفتگو اُس کے ابتدائی انٹرویوز میں سے تھی۔ وہ ہماری گفتگو سے مطمئن لگتا تھا۔انٹرویو ریکارڈ کرنے والے انجینئرز

کا بھی یہی خیال تھا کہ انٹرویو ''دھڑلے دار'' رہا۔

ہمیں کانفرنس ہال واپس جانے کی جلدی تھی۔ ہم یہ آخری سیشن مِس نہیں کرنا چاہتے تھے۔ منتظمین کی جانب سے بھی ہمیں تاکید تھی کہ آخری سیشن میں ضرور شامل ہونا ہے۔ ایک منتظم کی جانب سے تو ہمیں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ جو شرکاء صدارتی پینلز میں بیٹھے تھے انہیں اعزازی شیلڈ دینے کا پروگرام ہے۔ ہم نے جلدی کانفرنس میں پہنچنے کے لیے اجازت چاہی تو وڑائچ صاحب نے اپنی کار عنائت کر دی اور ہم گرمیت سنگھ کے ہمراہ الحمرا ہال پہنچ گئے۔

چار بج چکے تھے لیکن ابھی تک سیشن شروع نہیں ہوا تھا۔ ہال میں شوکت علی صاحب والا خیر مقدمی گیت ہی چل رہا تھا۔ ہم ہال میں آ کر بیٹھے تو کارروائی شروع ہو گئی۔ جناب اعزاز احمد آذر مائیک پر آ کر صدارتی پینل کے شرکاء کو سٹیج پر آنے کی دعوت دے رہے تھے۔

اس سیشن کی صدارت پاکستانی پنجاب کے چیف سیکریٹری کر رہے تھے۔ جبکہ مہمان خصوصی کی نشست پر جناب دیپک من موہن براجمان تھے صدارتی پینل کے باقی شرکاء میں مشرقی پنجاب سے آئی فلم ڈائریکٹر سنیتا دھیر، ڈاکٹر روپندر کور، ڈاکٹر مسز ڈھلوں، جناب غلام محی الدین، گائیک جناب شوکت علی، ڈاکٹر فاطمہ حسین، ڈاکٹر مصطفیٰ حبیب اللہ، گائیکہ ریشماں جی اور جناب فخر زمان شامل تھے۔

یہ سیشن قرآن پاک کی تلاوت سے شروع ہوا۔ اُس کے بعد ڈیکلریشن کمیٹی کا تیار کیا ہوا اعلان نامہ کمیٹی کے صدر جناب احمد سلیم نے پڑھا۔ اعلان نامہ کا خلاصہ یہ ہے۔

پاکستان، ہندوستان اور دنیا کے دیگر اٹھارہ ممالک سے آئے پنجابی لکھاری، صحافی اور عالم، سماجی، سیاسی، سائنسی اور انسانی حقوق کے علمبرداروں کی طرف سے بارہویں عالمی پنجابی کانفرنس لاہور کے سٹیج سے پچھلی گیارہ کانفرنسوں میں پاس ہوئی کانفرنسوں کے اعلان ناموں کی تصدیق کی گئی۔

امن کی ضرورت کا اعادہ کرتے ہوئے اس عزم کا اظہار کیا گیا کہ اکیسویں صدی کو امن کی صدی بنائے رکھنے کے لیے جدوجہد جاری رکھی جائے گی۔ اعلان نامہ میں یہ بات زور دے کر کہی گئی کہ ۱۹۴۷ء کی تقسیم کے وقت ہوا قتل عام اور گھلوگھارا سامراج کی سازش تھی۔ اب دونوں ملکوں کی آزادی اور خودمختاری کا احترام کرتے ہوئے دونوں ملکوں کے پنجابی کسی سامراج یا جنگ کی حامی طاقتوں کی کسی سازش کا شکار نہیں ہوں گے اور ایٹمی ہتھیاروں اور جنگوں کی مخالفت کرتے رہیں گے۔

امن، ثقافت، ادب اور فن کی حفاظت اور ترقی ماں بولی کے ساتھ مضبوط رشتہ استوار کرنے سے ہی ہوسکتی ہے۔ اس لیے پنجابی لکھاری اور ثقافتی کارکن دنیا بھر میں جہاں بھی ہوں، دنیا کی دوسری زبانوں کا احترام کرتے ہوئے پنجابی کے حقوق کے لیے لڑتے رہیں گے اور پنجابی بولی پر دوسری زبانوں کا غلبہ نہیں ہونے دیں گے۔ کیونکہ دونوں ملکوں میں پنجابی کا مقام کسی اور کو نہیں دیا جاسکتا۔

دونوں حکومتوں سے یہ مطالبے کیے گئے۔

- دونوں ملکوں کے عوام کی آزادانہ آمدورفت کے لیے دونوں حکومتیں ویزے کی پابندی ختم کرنے کا اعلان کریں اور اس پر عمل ہونے تک ملٹی پل اور ہر جگہ آنے جانے کے ویزے کا قانون لاگو کریں جیسا کہ ساری دنیا میں ہوتا ہے۔
- دونوں ملکوں کے سکولوں کالجوں میں پڑھائے جا رہے سیلبس کی کتابوں میں سے وہ باب نکالنے کے لیے عملی اقدامات کیے جائیں جن کی وجہ سے بچوں میں نفرت کے بیج بوئے جاتے ہیں اور پیار اور امن کے راستے میں رُکاوٹیں کھڑی کی جاتی ہیں۔
- امن کے عمل کو تیز کرتے ہوئے دونوں طرف کے لکھاریوں، دانشوروں، فن کاروں، محققوں، صحافیوں، طالب علموں اور دوسرے تمام شعبوں کے لوگوں کو ایک دوسرے کے ملک میں آنے جانے کے زیادہ سے زیادہ آسان مواقع فراہم کیے جائیں تا کہ ایک دوسرے کی ترقی علم اور ہنر سے فائدہ اُٹھایا جاسکے۔ کتابوں اور رسالوں کی

ترسیل کی کھلی اجازت دی جائے۔

- پنجاب میں ادبی اور ثقافتی اکیڈمیوں کے سربراہ بیوروکریٹوں کی جگہ پنجابی لکھاریوں، عالموں اور فن کارلوگوں کو مقرر کیا جائے۔
- لاہور کے شادمان چوک کا نام بدل کر دونوں ملکوں کے سانجھے شہید بھگت سنگھ کے نام پر رکھا جائے اور ان کی ایک شاندار یادگار لاہور میں بنائی جاوے۔
- لاہور اور مغربی پنجاب کے دوسرے شہروں اور قصبوں کے نام گرو صاحبان صوفی شاعروں، آزادی کے مجاہدوں اور سانجھے شہیدوں کے نام پر رکھے جائیں۔
- پنجابی زبان کو دونوں رسم الخطوں (گرمکھی، شاہ مکھی) میں پڑھایا جائے۔

درج بالا قراردادیں پاس کرنے کے لیے جب ہاتھ کھڑے کروائے گئے تو سب نے دونوں ہاتھ کھڑے کر کے منظوری دے دی۔ ہال بڑی دیر تک تالیوں سے گونجتا رہا۔

قراردادیں پاس کرنے کے بعد مقررین کے خطاب کی باری آئی تو سب نے کانفرنس کو کامیابی سے ہمکنار کرنے پر جناب فخر زمان کو مبارک باد دی۔ امن اور دوستی کو برقرار رکھنے کے لیے جدوجہد جاری رکھنے پر زور دیا گیا اور پنجابی زبان کو اُس کے اصلی مرتبے پر پہچانے کے عزم کا اعادہ بھی کیا گیا۔

آخر میں دونوں پنجابوں کی اُن عظیم شخصیات کو اعزازات سے نوازا گیا جنھوں نے پنجابی زبان، امن، دوستی اور دونوں ملکوں کی حکومتوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے میں کردار ادا کیا تھا۔ جو شخصیات موجود نہ تھیں اُن کو بھی اعزازی شیلڈز دی گئیں۔ اُس کے بعد جناب فخر زمان کی طرف سے آئندہ کانفرنسیں مختلف انداز سے کروانے کا اعلان کیا گیا۔

رات کو مشاعرہ اور کھانا لاہور چیمبر آف کامرس اینڈ انڈسٹری کے چیئرمین کے فارم ہاؤس میں تھا جو کہ لاہور سے باہر رائے ونڈ روڈ پر تھا۔ کانفرنس پانچ بجے کے قریب ختم ہوگئی تھی۔ پروفیسر عاشق رحیل کے ایک ادارے ''ادبی بازگشت'' کی طرف سے مہینے میں ایک بار مشاعرہ کروایا جاتا ہے۔ یہ مشاعرہ آج شام سات بجے ہو رہا تھا۔ جس میں شامل

ہونے کے لیے پروفیسر صاحب نے ندیم پرمار کو دعوت نامہ دیا ہوا تھا۔ دوپہر کے وقت پروفیسر صاحب نے دوبارہ مشاعرہ میں آنے کے لیے تاکید کی تھی۔ ویسے بھی آج ندیم پرمار ''چڑھدی کلا'' میں تھا۔ سو ہم کانفرنس ختم ہوتے ہی پنڈال میں چائے کے لیے جانے کی بجائے پروفیسر رحیل کی کار میں بیٹھ کر اُن کے گھر کی طرف چل دیے۔ اُن کا گھر سنت نگر لاہور میں ہے۔ سنت نگر جاتے ہوئے راستے میں لاہور کی مشہور جگہوں کا سفری نظارہ کرتے گئے اور اُن کی تاریخی اہمیت کے متعلق معلومات بھی حاصل کرتے رہے۔

لاہور کا اسمبلی ہال، پرانی کوتوالی، جنرل پوسٹ آفس اور جین مندر والی جگہ دیکھی۔ جب ہندو جنونیوں نے بابری مسجد کو شہید کر دیا تھا تو مسلم جنونیوں نے یہ جین مندر گرا کر مٹی کا ڈھیر بنا دیا تھا۔ پروفیسر رحیل صاحب بڑے دکھی دل سے کہہ رہے تھے کہ ہماری طرح کے لبرل سوچ کے لوگوں نے اس جنونیت کی ڈٹ کر مخالفت کی تھی لیکن بھیڑ کے آگے کسی کا زور نہ چل سکا۔ میرے منہ سے اچانک ہی نکل گیا ''جنونی لوگوں کا اصل میں کوئی مذہب ہوتا ہی نہیں۔ اُس طرف ایک مسجد شہید کی گئی اور اِدھر پاکستان اور دوسرے اسلامی ملکوں میں کئی مندر مٹی کا ڈھیر بن گئے۔ اس طرح کے کارنامے انسانوں کے درمیاں نفرت کا باعث بننے کے علاوہ اور کوئی مقصد نہیں رکھتے۔''

پرانی انارکلی میں سانڈرنس کے قتل ہونے والی جگہ بھی دیکھی اور ڈی۔اے۔وی کالج کی اُس بلڈنگ کے قریب سے گزرے جس میں سے بھگت سنگھ اور اُس کے ساتھی سانڈرس کو قتل کرنے کے بعد بھاگتے ہوئے گزرے تھے۔ ان مقامات کو دیکھ کر دیس کی آزادی کے لیے مر مٹنے والے پروانوں کی تصویریں نظروں میں پھرنے لگیں۔ آج حکومتوں نے اُن کے نظریات کو تو بھلا دیا ہے مگر اُن کے نام استعمال کر رہی ہیں۔ اس جگہ کو دیکھ کر آج کے اجلاس میں پاس کی گئی بھگت سنگھ کے نام والے چوک کی قرارداد کی اہمیت کا احساس ہوا۔ یہ احساس بھی ہوا کہ دیس کی تقسیم سے قبل کے شہیدوں کو دونوں ملکوں کے سانجھے شہیدوں کا رتبہ دینے کا مطالبہ ٹھیک ہے۔

میرے دماغ میں ان جگہوں پر ہوئے واقعات کی فلم چل رہی تھی جب کہ ندیم پر مارا اپنے بچپن کی یادوں کو عاشق رحیل جی کے ساتھ ''سانجھا'' کر رہا تھا۔ جب وہ آٹھ نو سال کی عمر میں یہاں سنت نگر میں اپنے چچا کے پاس رہتا رہا تھا۔

ہم رحیل صاحب کے گھر پہنچے۔ انہوں نے چائے کے لیے کہا اور فوراً ہی چائے آ گئی۔ مشاعرے کا وقت ہو رہا تھا۔ چائے کے ساتھ ملتانی حلوہ کھایا۔ اُس کا ذائقہ کوٹ کپورے کی مشہور مٹھائی ڈھوڈا☆ جیسا ہی تھا۔ شکل میں بھی اُس جیسا ہی تھا۔ کوٹ کپورے والوں نے ملتانی کا نام بدل کر ڈھوڈا رکھ دیا اور امیر ہو گئے۔

چائے پی کر تیار ہوئے تو رحیل صاحب کہنے لگے کہ ابھی پانچ سات منٹ رُکنا پڑے گا۔ نماز کا وقت ہو رہا ہے۔ وقفے سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے رحیل صاحب ندیم کے لیے اپنی کتابوں کا سیٹ لے آئے۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں شاہ مکھی پڑھ سکتا ہوں۔ میں نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا ''رحیل صاحب'' میں سن سنتالیس سے پہلے کی پیدائش ہوں۔ اس لیے میرے نصیب میں اُردو پڑھنا لکھنا تھا۔'' پھر وہ میرے لیے بھی اپنی کتابوں کا سیٹ لے آئے۔ بیٹھے بیٹھے اُن سے وعدہ ہو گیا کہ میں اُن کی کہانیوں کی کتاب کو لِپیّ انتر کر کے گرمکھی رسم الخط میں چھپوانے کی کوشش کروں گا۔ پروفیسر عاشق رحیل پاکستان کے نامور لکھاریوں میں سے ایک ہیں۔ بھارت یا دوسرے ممالک سے کوئی لکھاری پاکستان جاتا ہے تو پروفیسر رحیل صاحب اُس کی میزبانی کے لیے حاضر ہوتے ہیں۔ اُن کی شاعری میں سے ایک قطعہ نمونے کے طور پر پیش ہے:

روگ اولے دل نوں ہون تاں کیہ کریے
چپ چپیتے اکھیاں رون تاں کیہ کریے
رہندی اے سجناں نوں ملن دی تانگھ رحیل
ویری اگے پچھے ہون تاں کیہ کریے

☆ ''ڈھوڈا'' پاکستانی پنجاب میں خوشاب شہر سے منسوب ہے۔

پاکستان میں پنجابی کتابوں کی چھپائی اور اُن کی فروخت کی بات چلی ہی تھی کہ نماز کا وقت ہو گیا اور ہم پروفیسر رجیل صاحب کی نئی کار میں مشاعرہ گاہ کی طرف چل پڑے۔ اس کار کا ڈرائیور بھی اُن کا بیٹا ہی تھا۔ لڑکا دوپہر سے ہی ہمارے ساتھ تھا اور آج کا دِن اُس نے ہمارے لیے وقف کر رکھا تھا۔ اُس نے کار اسلامیہ بلڈنگ کے سامنے لے جا کر روک دی۔ یہیں مشاعرہ ہو رہا تھا۔ مشاعرہ میں ہمیں بہت عزت اور احترام کے ساتھ لایا گیا۔ اس مشاعرے میں لاہور کے اُردو اور پنجابی کے نامور شاعر تشریف لائے تھے۔ سب سے پہلے تعارف کا سلسلہ چلا۔ پھر سیکرٹری نے مشاعرہ شروع کرنے کے لیے صاحب صدر سے اجازت طلب کی۔ صدر کے ساتھ ہمیں بھی سٹیج پر بٹھایا گیا۔ اگر چہ ہم نے کہا بھی کہ جلد ہی ہم نے ایک اور مشاعرے کے لیے جانا ہے۔

قرآن شریف کی تلاوت کے ساتھ مشاعرے کا آغاز ہوا۔ اُس کے بعد شاعروں نے اپنا اپنا کلام سنانا شروع کیا۔ نو بج چکے تھے۔ ہمیں دوسرے مشاعرے میں جانے کی جلدی تھی۔ گاڑیوں نے تو شرکاء کو ساڑھے آٹھ بجے تک الحمرا سے مشاعرہ گاہ میں پہنچا دینا تھا۔ سب کو نو بجے تک رائے ونڈ والے فارم ہاوس پر پہنچنے کی تاکید کی گئی تھی لیکن ہم ابھی تک اسی محفل میں محوِ سرور تھے۔ ہم نے صاحبِ صدر سے رُخصت ہونے کی اجازت چاہی تو انہوں نے راوئت کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ندیم پرمار کو پہلے کلام پڑھنے کے لیے بلا لیا۔ پھر اُردو کے شاعر جناب اقبال رہی صاحب نے ہمارے اعزاز میں دو قطعے پیش کیے جو کہ انہوں نے وہاں بیٹھے ہوئے فی البدیہہ کہے تھے۔ قطعے یوں تھے:

کینیڈا سے شہرِ فن میں آئے ہیں جرنیل سنگھ
ساتھ میں پرمار کو بھی لائے ہیں جرنیل سنگھ

اُن کی آمد پر مبارک باد دیتے ہیں ندیم
یادگار اک ذہن کی ایجاد دیتے ہیں ندیم

یہاں پر یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ مشاعرے کی محفل میں اپنا تعارف کرواتے

ہوئے ندیم پر مارنے کہا تھا کہ میرا پاکستان آنے کا کوئی پروگرام نہیں تھا، مجھے سیکھا صاحب لے کر آئے ہیں۔ دوسرا قطعہ تھا:

معمار قوم کا انہیں کہتے ہیں اہلِ دل
شاعر و ادیب نہایت عظیم ہیں
اس بازگشت ادارے کی تقریبِ خاص میں
جرنیل سنگھ قاسم و محضر ندیم ہیں

راہی صاحب کی اس ذرّہ نوازی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ہم بھری محفل اور صدارتی کرسیوں سے اُٹھ کر جانا روایت کے خلاف اور گستاخی کے مترادف سمجھتے تھے لیکن ہماری بھی مجبوری تھی۔ ہم کینیڈا سے یہ کانفرنس ہی اٹینڈ کرنے آئے تھے۔ کل کا ثقافتی پروگرام ہم نے مِس کر دیا تھا اگر آج آخری پروگرام بھی اٹینڈ نہ کر سکتے تو یہ بہت بڑی گستاخی ہوتی سو کسی نے بھی اعتراض نہ کیا اور ہمیں خوشی خوشی الوداع کہا۔

مشاعرے والی بلڈنگ سے باہر آ کر ہم نے کنول مشتاق کو فون کیا کہ ہمیں لے کر جانے کے لیے کوئی انتظام کیا جائے کیونکہ پروفیسر رحیل اُس مشاعرے میں شریک نہیں ہونا چاہتے تھے۔ وہ ''بازگشت'' کے مشاعرے کے منتظمین میں شامل تھے اور انہوں نے کانفرنس کے منتظمین سے نہ آ سکنے کی اجازت لے رکھی تھی۔ کنول مشتاق نے کہا کہ آپ لوگ بہت لیٹ ہو چکے ہیں یہ یہاں سے سب لوگ جا چکے ہیں۔ آپ لوگ کوئی اور بندوبست کر کے پہنچ جائیں۔

اب پروفیسر رحیل صاحب ہی تھے جو ہمیں مشاعرے والی جگہ پہنچا سکتے تھے۔ انہوں نے یہاں سے اجازت لے کر اپنے لڑکے کو کار میں رائے ونڈ روڈ کی جانب چلنے کے لیے کہا۔ وہاں پہنچنے میں ہمیں آدھا گھنٹہ لگ گیا۔ مشاعرہ ابھی شروع نہیں ہوا تھا۔ لاہور چیمبر آف کامرس اینڈ انڈسٹری کے صدر کا یہ فارم ہاؤس تقریباً ایک میل میں پھیلا ہوا تھا۔ روز ورٹ کے سامنے کئی فوارے چل رہے تھے اور اُن پر قسم قسم کی روشنیاں چل رہی تھیں دُور

دُور تک فلڈ لائٹوں کی روشنی دِن کا منظر پیش کر رہی تھی۔ اندر باہر کاریں ہی کاریں نظر آ رہی تھیں۔ باہر لان میں کرسیاں ہی کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ آئے مہمان کرسیوں پر بیٹھے چائے پانی پی رہے تھے۔ کچھ اِدھر اُدھر چہل قدمی کرتے ہوئے رات کے خوبصورت نظارے کا لطف لے رہے تھے۔ سفید وردیوں میں سجے بیرے قیمتی طشتریوں میں مشروبات اور کھانا لا رہے تھے۔

یہاں ہماری سہ ماہی ''جاگ'' کے ایڈیٹر جناب طارق گوجر سے اُن کے شاعر دوست جناب عنائت اللہ عاجز کے ہمراہ ملاقات ہوگئی۔ انہوں نے ہمیں اپنے میگزین ''جاگ'' کی ایک ایک کاپی دی۔ ساتھ ہی کل اُن کے ہمراہ لائل پور (اب فیصل آباد) جانے کے متعلق بھی بات ہوئی۔ ویسے تو وہ رات کو ہی عاجز صاحب کے ہمراہ جانا چاہتے تھے لیکن ہماری سہولت کے پیشِ نظر انہوں نے رات لاہور میں ہی رہنے کا پروگرام بنا لیا۔ جناب فخر زمان، ڈاکٹر دیپک من موہن اور کامرس اینڈ انڈسٹری کے صدر اس طرف آ رہے تھے۔ فخر صاحب چیمبر کے صدر کو مہمانوں کا تعارف کروا رہے تھے۔ دیپک من موہن جی اُن کی مدد کر رہے تھے۔ اس رسمی تعارف کے بعد مشاعرہ شروع ہوا۔

صدارتی پینل میں جناب فخر زمان کے ساتھ ڈاکٹر دیپک من موہن اور انڈسٹری کے متعلقہ دو اور نمایاں شخصیات براجمان تھیں۔ پروگرام شروع ہونے کے ساتھ ہی تقریروں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ مہمان اکتاہٹ سی محسوس کر رہے تھے۔ اس لیے تقریریں مختصر ہی رہیں۔ تقریروں کا موضوع پہلے والا ہی تھا۔ آدھ گھنٹے میں تقریریں ختم ہوگئیں اور مشاعرہ شروع ہوگیا۔ مشاعرہ شروع ہوتے ہی کسی نے مشورہ دیا کہ مشاعرہ کی صدارت کے لیے شاعر ہی ہونے چاہئیں۔ اس مشورے کو مانتے ہوئے سٹیج پر بیٹھے حضرات پنڈال میں آ بیٹھے۔

اب مشاعرے کے صدارتی پینل میں ندیم پرمار، بابا نجمی اور سنتو سنگھ سنتو کھ کرسیوں پر آ بیٹھے۔ یہ مشاعرہ ندیم کی صدارت میں شروع ہوا۔ مشاعرے میں بہت کم

شعرأ کو بلایا گیا۔ ہراِک شاعر نے اپنی ایک ایک تخلیق سنا کر مشاعرے کے دورانیہ کم رکھا اور مشاعرے کا لطف بھی دوبالا کیا۔

رات بارہ سے زیادہ ہو چکی تھی۔ کھانے کی میزوں پر کئی قسم کے کھانے چن دیے گئے تھے۔ مہمان کھانے کے ساتھ ساتھ حُسنِ انتظام کی بھی تعریف کر رہے تھے۔ کھانے کے بعد ہم پروفیسر رحیل اور اُن کے لڑکے کا شکریہ ادا کر کے رُخصت ہونے لگے تو انہوں نے کہا کہ آپ جتنی دیر لاہور میں ٹھہریں میرے گھر میں ہی قیام کریں۔

ندیم نے انہیں بتایا کہ کل ہم فیصل آباد جا رہے ہیں۔ وہاں ہمیں دو دِن لگ جائیں گے۔ ہم نے صرف اپنا سامان ہی رکھنا ہے۔ اس کا انتظام قدسی صاحب کے گھر ہو گیا ہے۔ آپ نے ہمارے لیے اتنا تردد کیا، آپ کا بہت شکریہ۔

پروفیسر رحیل صاحب نے دوبارہ کہا، آپ واپسی پر ایک دِن کے لیے ہمارے پاس ضرور رُکیں۔ لاہور کی سیر بھی ہو جائے گی اور کھل کر تبادلۂ خیال بھی ہو گا۔

ہم نے ان سے دوبارہ ملنے کا وعدہ کر کے انہیں الوداع کہا اور ایک بار پھر اُن کی مہمان نوازی کے لیے اُن کا شکریہ ادا کیا۔

رحیل صاحب سے رُخصت ہو کر ہم اپنی کوچ کی طرف آ گئے۔ ڈرائیور یار محمد خاں ہم سے شکوہ کر رہا تھا کہ آپ نے مجھے شام کو جاتے وقت بتایا ہی نہیں میں ساڑھے آٹھ بجے تک آپ کا انتظار کرتا رہا۔ اگر آپ نے مجھے بتایا ہوتا تو میں آپ کو آپ کے ٹھکانے پر سے جا کر لے آتا۔

ہم اب اُس کا شکریہ ادا کر سکتے تھے۔ شکریے کے دو بول ادا کر کے ہم کوچ میں بیٹھ گئے۔ آج فرنٹ سیٹ پہلے ہی بک ہو چکی تھی۔ ہم پچھلے حصے میں بیٹھ گئے۔

فارم ہاؤس میں سے بہت سے مہمان جا چکے تھے۔ اکا دُکا لوگ ہی کھڑے باتوں میں مصروف تھے۔ فوارے بند ہو چکے تھے۔ سفید کپڑوں میں لپٹی خالی کرسیاں الگ ہی منظر پیش کر رہی تھیں۔ رنگ برنگی روشنیاں اگرچہ بجھا دی گئی تھیں مگر فلڈ لائٹس میں

پھولوں کے رنگ اور بھی نکھرے لگتے تھے۔

یار محمد خان اب بھی باہر کھڑا کسی کے انتظار میں تھا۔ کوچ میں دلی کے دو سردار صاحبان اور جگبیر سنگھ جی کے بیٹے کے آ جانے سے سواریاں زیادہ ہو گئی تھیں۔ ڈاکٹر دیپک من موہن کے آنے اور کنول مشتاق کی طرف سے اجازت ملنے پر کوچ فارم ہاؤس سے باہر آ کر سڑک پر کچھ دیر کھڑی رہی۔ باہر سڑک پر پولیس اسکارٹ کوچ کے انتظار میں تھی۔ پیچھے بیٹھے ہونے کی وجہ سے پتہ نہیں چل رہا تھا کہ کوچ باہر آ کر رُک گئی ہے۔ تقریباً پانچ منٹ رُکے رہنے کے بعد کوچ پولیس کی گاڑی کے پیچھے چل پڑی۔ جب ہم ایمبیسیڈ ر ہوٹل پہنچے تو دو بجنے والے تھے۔ آج زیادہ بھاگ دوڑ کی وجہ سے تھکن سے بُرا حال تھا۔ اشنان کیے بغیر ہی بستروں میں جا دُبکے۔ پتہ ہی نہیں چلا کہ کب گہری نیند نے آ لیا۔



ساندل بار کی طرف

اگرچہ رات کو دو بجے ہی سوئے تھے مگر ۲۰ راپریل کی صبح چھ بجے ہی آنکھ کھل گئی۔ آج ہمارا ندیم پرمار کے جنم گاؤں جانے کا پروگرام تھا۔''پنجابی میگزین'' جاگ کے ایڈیٹر جناب طارق گوجر ہمارے کمرے کے سامنے والے کمرے میں ٹھہرے ہوئے تھے۔

انہوں نے ہمیں اپنے ہمراہ لے کر جانا تھا۔ ہم نے جلدی سے تیار ہو کر سامنے والے کمرے کے دورازے پر دستک دی تو دیکھا کہ طارق بھی تیار ہے۔ اُس کے ساتھ بذریعہ بس فیصل آباد جانے کا پروگرام فائنل ہو گیا تو ہم نے اپنے کمرے میں آ کر پہلا کام یہ کیا کہ اپنا سارا سامان اپنے اپنے اٹیچی میں سنبھال کر رکھ لیا اور دو دِنوں کے لیے استعمال میں آنے والے کپڑے اپنے اپنے بیگ میں ڈال کر فارغ ہو گئے، پھر بے فکر ہو کر ناشتے کے لیے چلے گئے۔ آج ناشتہ بھی تسلی کے ساتھ کیا۔

ناشتہ کرنے کے بعد ریسیپشن کاونٹر پر آ گئے۔ اگرچہ کمرہ بارہ بجے تک فارغ کرنا ہوتا ہے لیکن ہم یہ کام ابھی کر دینا چاہتے تھے۔ سو اپنے کمروں کا حساب نکلوایا۔ بل کے پیسے دے کر رسید لی اور فارغ ہو کر اپنے کمرے میں آ گئے۔

ہم اپنا سارا سامان سنبھال چکے تھے۔ پڑھنے کی غرض سے بھی کوئی کتاب باہر نہیں رکھی تھی۔ میں نے سوچا کہ کیوں نہ طارق گوجر سے بات چیت کی جائے۔ وہ بھی تیار ہو کر فارغ ہو گا۔ سامنے والے کمرے کی طرف دیکھا تو اس کا دروازہ کھلا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اندر جھانکا تو سامنے ایک نوے سال کے لگ بھگ عمر کے بزرگ بیٹھے نظر آئے۔ میں نے اُن سے طارق کے بارے میں پوچھا تو کہنے لگے ''بیٹھ جاؤ سردار صاحب، طارق سے بھی ملا دیتے ہیں۔ کہاں سے تشریف لائے ہیں۔'' میں انہیں اپنا تعارف کروانے ہی لگا تھا کہ طارق واش روم سے باہر آ گیا۔ اُس نے اُن کا مجھ سے تعارف کروایا ''یہ کمرہ تو ان کے نام پر بک ہے۔ میں تو ان کا ایک شب کا مہمان ہوں۔''

یہ عظیم شخص جن کے سامنے میں بیٹھا مان محسوس کر رہا تھا۔ گیانی عبدالغفور قریشی تھے۔ اُن کا نام شروع کے پنجابی پیاروں میں لیا جاتا ہے۔ گیانی عبدالغفور قریشی نے مغربی پنجاب میں پنجابی کو زندہ رکھنے کے لیے بہت کوشش کی۔

گیانی عبدالغفور قریشی اس وقت نوے کی دہائی میں ہوں گے اُن کا پچھلا پنڈ ''چوندہ''، ضلع سنگرور ہے جو کہ مشرقی پنجاب میں ہے۔ انہوں نے دھوری سے دسویں پاس کی، وہ پہلے مسلمان تھے جنہوں نے گیانی کا امتحان گرمکھی رسم الخط میں پاس کیا انہوں نے گیانی کا امتحان ۱۹۴۳ء میں دیا تھا اور ہائی سیکنڈ ڈویژن میں پاس ہوئے تھے۔

انہیں گیانی کی پڑھائی کے دوران بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اُن دِنوں گیانی کا زیادہ تر سیلبس گروبانی پر ہی مشتمل تھا۔ اس میں پنجابی لکھاری خال خال ہی تھے۔ کٹڑ سکھوں کی طرف سے شور و غل مچایا گیا کہ مسلمان گروبانی کی بے ادبی کر رہا ہے۔ بانی کو مریادا کے ساتھ نہیں پڑھتا۔ گاؤں میں تناؤ پیدا ہو گیا، گیانی جی کے والد بڑے ساؤ آدمی تھے۔ وہ گاؤں کے لوگوں کے ساتھ تعلقات بگاڑنا نہیں چاہتے تھے۔ سو انہوں نے کہا ''بیٹا تم نے گیانی بن کر کون سا پاٹھ کروانا ہے۔'' ''چھوڑ اس گیانی کی پڑھائی کو۔'' یہ کہہ کر انہوں نے گیانی کی تعلیم سے روک دیا۔

گاؤں میں اس کے خلاف ''کٹھ'' بھی کیا گیا جس میں اِردگرد کے گاؤں سے بھی سکھ معتبرین شامل ہوئے۔اُس وقت گیانی گوردت سنگھ کے باپ گیانی عبدالغفور قریشی کی مدد کو پہنچے۔ وہ اس علاقے کے سکھوں میں بہت ہردل عزیز تھے۔انہوں نے دلیل دی کہ ''اگر تمہیں گروبانی کی بے ادبی پر اعتراض ہے تو پنجاب یونیورسٹی کے سلیبس بنانے والوں پر زور ڈالو کہ گروبانی کو سلیبس میں سے نکال دیں۔اگر سلیبس میں گروبانی ہوگی تو کیا ہندو، کیا مسلمان، کیا سکھ سب نے اس کو پڑھنا ہے، کسی کو امتحان دینے سے نہیں روکا جا سکتا۔

انہوں نے لوگوں کو سمجھایا کہ سلیبس کی کتابوں میں درج شبد اشلوک پڑھنے سے گروبانی کی بے ادبی نہیں ہوتی چاہے اُسے سر ڈھانپ کر پڑھا جائے یا ننگے سر۔ ہاں پوتھیاں پڑھتے وقت مریادا کا خیال رکھنا چاہیے۔اس بات پر بہت دیر بحث جاری رہی مگر پھر کسی نے پڑھنے سے نہیں روکا۔

گیانی جی کو ابتدا میں ہی پریت لڑی پڑھنے کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔اس لیے اُن کے خیالات میں انتہا پسندی نہیں آئی۔اُن کا عقیدہ یہی رہا۔

اوّل اللہ نور اپایا قدرت کے سبھ بندے
اک نور سے سب جگ اُپجیا کون بھلے کو مندے
''مانس کی جات سبھے ایکے پہچان لو۔''

پاکستان بننے کے بعد انہیں اُجڑ کر آنا پڑا۔ پاکستان آ کر بھی وہ پنجابی کی ترقی کے لیے جتن کرتے رہے۔مغربی پنجاب میں اُردو کا غلبہ ہو چکا تھا اور پنجابی کو دیوار کے ساتھ لگا دیا گیا تھا۔ پنجابی زبان کا کوئی لکھاری نظر نہیں آ رہا تھا۔ پھر بھی اُنگلیوں پر گنے جا سکنے والے کچھ شیدائی تھے جو سینہ تان کر پنجابی زبان کے علم دار بنے ہوئے تھے۔اُن میں سے ہی ایک گیانی عبدالغفور قریشی تھے۔

انہوں نے مغربی پنجاب میں اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے بعد ۱۹۵۱ء میں پہلی کتاب ''پنجابی زبان دا ادب تے تاریخ'' لکھی۔ یہ کتاب ۴۸۷ صفحات پر مشتمل تھی۔اُس

کے بعد ''پنجابی ادب دی کہانی''، لکھی جو بہت مقبول کتاب ہے۔ ۱۹۶۵ء میں پروفیسر موہن سنگھ کی شاعری کے انتخاب پر مشتمل کتاب ''کوتا دا اوتار''، لکھی۔ اُن کی پہلی دو کتابیں پنجابی کے سلیبس کا حصہ بنیں۔ انہیں پنجابی زبان کی خدمت کے سفر میں بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا مگر وہ ثابت قدمی سے اپنے سفر پر گامزن رہے۔

۲۰۰۴ء میں اُن کی شریک حیات دولتاں بی بی انہیں چھوڑ کر خالقِ حقیقی سے جاملیں۔ اُن کا جنم استھان لدھیانہ ضلع کا مشہور میلے والا گاؤں ''جرگ'' تھا۔ آخری وقت تک اُن کا اپنے جنم گاؤں سے دلی لگاؤ رہا۔ جب بھی مشرقی پنجاب سے کوئی لکھاری اُن کے پاس آتا تو وہ سمجھتیں کہ جیسے کوئی اُن کے میکے سے آیا ہو۔ جب وہ شدید بیماری کی حالت میں تھیں تب بھی یہی پوچھتی رہتی تھیں۔

''کوئی انڈیا سے تو نہیں آیا۔''

گیانی جی کو اپنی شریک حیات سے بہت پیار تھا۔ باتیں کرتے ہوئے اُن کی آنکھوں میں پانی اُتر آیا تھا۔ اس عمر میں اُن کا صدمہ سہنا گیانی جی کے لیے بہت مشکل ہو گیا تھا۔

دِل تو چاہ رہا تھا کہ اُن کے پاس بیٹھ کر اُن کی زندگی کے متعلق اور باتیں کی جاتیں مگر نئی منزل کی طرف جانے کی جلدی کی وجہ سے کھل کر باتیں نہ ہو سکتی تھیں۔ دِل میں یہ دُکھ لے کر بھی اُس کمرے سے نکل رہے تھے کہ پنجابی کی یہ نامور شخصیت تین دِن سے ہمارے سامنے والے کمرے میں ڈیرہ لگائے بیٹھی ہے مگر ہمیں اُس کا پتہ تک نہیں چل سکا۔ میں نے سوچا کہ ہم پر بھی کینیڈا کی ثقافت کا اثر پڑ رہا ہے جہاں ہم پڑوسی کے متعلق بھی نہیں جانتے بس سب اپنے اپنے دھندوں میں ہی جی رہے ہوتے ہیں۔ کاش! اگر تین دِن قبل پتہ چل جاتا کہ ہمارے سامنے پنجابی زبان کی اتنی عظیم شخصیت رہ رہی ہے تو اُس کے بارے میں اور بھی بہت کچھ جانا جا سکتا تھا۔ پھر ہم اُن کے ساتھ فوٹو کھچوا کر اُن کی یاد کو اپنے پاس سنبھال کر اپنے کمرے میں آ گئے۔

کمرے میں آ کر ندیم کے شاعر دوست عبدالکریم قدسی کو فون کیا کیونکہ ہم نے اپنا سامان اُن کے گھر رکھنا تھا۔ انہوں نے کہا کہ وہ اُن کا داماد ٹھیک نو بجے کار لے کر ہوٹل پہنچ جائیں گے۔ یعقوب ۹ بجے سے پندرہ منٹ قبل ہی آ گیا۔ ہم نے اپنے کمرے کی چابی ریسپشنٹ کے حوالے کی اور طارق گوجر کے ہمراہ کار میں آ بیٹھے۔

بس کی سواری

یعقوب میاں کی کار شملہ پہاڑی پارک سے مڑتی، لاہور کی اُن سڑکوں پر گھومتی جن پر سے ہم پہلے نہیں گزر رہے تھے، بسوں کے اڈے پر جا رُکی۔ ہمارا سامان قدسی صاحب کے گھر پہنچایا جانا تھا اس لیے ہم اپنا اپنا بیگ اُٹھائے فیصل آباد والی بس کے کاونٹر کی طرف چل دیے۔ اس بس سٹینڈ پر بھی لدھیانے کے بس سٹینڈ کی طرح بسوں کا ''گھڑمس'' لگا ہوا تھا۔ ریڑھیوں اور چھابڑیوں والے بھی اپنا سامان بیچنے کے لیے آوازیں لگا رہے تھے۔

مشرقی اور مغربی پنجاب کے بس اڈے میں سواریوں کے لباس کے علاوہ اور کوئی زیادہ فرق نہ تھا۔ سواریاں اپنی منزل تک پہنچنے کے لیے تیزی سے بسوں کی جانب رواں دواں تھیں۔ بسوں کی حالت مشرقی پنجاب کی بسوں سے بہت اچھی لگ رہی تھی۔ ہم نے فیصل آباد والی بس کا پتہ کیا تو بس تیار کھڑی تھی۔ ہم نے کنڈکٹر سے ٹکٹ کے متعلق پوچھا تو جواب ملا ''بس میں بیٹھ جاؤ، ٹکٹ اندر ہی ملیں گے۔''

یہ ڈیلیکس بس بالکل نئی نکور تھی۔ بس کی سیٹیں جہاز کی سیٹوں کی طرح تھیں۔ اگلے حصے میں سیٹیں خالی پڑی تھیں۔ بس میں اگلے دروازے سے ہی چڑھا اور اُترا جا سکتا تھا۔ بس میں داخل ہونے سے لے کر اپنی سیٹ پر بیٹھ جانے تک ہر سواری کی نظر ہم پر ہی ٹکی رہتی۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے کسی اکیلے سکھ نے یہاں بس میں کم ہی سواری کی ہو۔ نزدیکی سواریوں نے ''ست سری اکال'' بلا کر ہمارا حال چال بھی پوچھا اور ہمارے متعلق تھوڑی سی معلومات بھی لیں۔ میں سواریوں سے باتیں کرنا چاہتا تھا لیکن پھر انہوں نے خاموشی سی اختیار کر لی۔ بس میں خاتون سواریاں بہت کم تھیں۔ یہ بس نان سٹاپ تھی اور اسے فیصل آباد ہی جا رُکنا تھا۔

بس ابھی چلی نہیں تھی۔ طارق اُٹھ کر ٹکٹیں لینے کے لیے جانے لگا تو ہم نے اُسے زور دے کر روک دیا کہ ٹکٹیں وہ نہیں لے گا وہ یہ کہہ کر نیچے چلا گیا کہ وہ ٹکٹیں لینے نہیں جارہا۔ وہ اپنے ساتھ کنوؤں کا لفافہ لے آیا۔ میں نے دل میں سوچا کہ طارق نے کنولا نے والی اچھی عقل مندی کی ہے۔ اگر چہ ہمارے پاس پانی کی بوتلیں موجود تھیں۔ مگر ہم کھانے کی کوئی چیز ساتھ نہیں لائے تھے بس اڈے سے آگے بڑھی تو کنڈکٹر ٹکٹ کے لیے آ گیا۔ طارق نے خدا جانے اُسے کیا اشارہ کیا تھا کہ اُس نے ہمارے بار بار کہنے پر بھی ہم سے پیسے نہیں پکڑے، بس ٹکٹیں ہمیں تھمادیں۔ جب اُسے طارق نے پیسے دیے تو اس نے لے لیے۔ جب پانچ سو کے نوٹ میں سے اُس نے ایک سو ستر روپے طارق کو واپس کیے تو پتہ چلا کہ طارق نے ہمارا کرایہ بھی دے دیا ہے۔

یہ تو ہمارے ساتھ سراسر زیادتی ہوئی ہے۔ ہمیں کم از کم کرایہ تو دینے دیتے۔ آپ پہلے بھی یہ پھل لے کر آئے ہیں۔ ہمارے اوپر اتنا بار نہ چڑھائیں۔ آپ ہمارے پاس آئیں تو شاید ہم اتنا تردد نہ کر سکیں'' میں نے طارق سے کہا۔''

''یہ بار کیسا، آپ ہمارے مہمان ہیں۔ ہم بھی پچھلے سال عالمی پنجابی کانفرنس میں شرکت کر کے آئے ہیں، وہاں ہماری بھی بڑی مہمان نوازی ہوئی تھی۔''

طارق کی بات سن کر ہمیں چپ ہونا پڑا اور مجھے سوبھا سنگھ آرٹ گیلری اندریٹا کی بلڈنگ کے ماتھے پر لکھے ہوئے انگریزی کے یہ الفاظ یاد آ گئے۔

"Grow more good"

آج دو دیسوں کے عوام کے دِلوں میں نفرت کی جگہ پیار کے بیج بوئے جارہے ہیں۔ لوگ پیار کی فصل بیج رہے ہیں۔ اگر یہ سلسلہ چلتا رہا تو نفرت کے بیج کا قلع قمع ہوگا اور ہر طرف پیار ہی پیار پھوٹ پڑے گا۔

دِل کی کھڑکی بند کر کے بس کی کھڑکی سے باہر جھانکا تو باہر مٹی کے اونچے اونچے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے سڑک بہت اونچی کر کے بنائی جارہی ہو۔ بس ان

ڈھیروں کے ساتھ ساتھ نیم پختہ سڑک پر جارہی تھی۔ بس شاہدرے سے گزرتے ہوئے راوی دریا پار کرگئی۔ راوی کا پل بہت لمبا ہے اور راوی کا پاٹ بھی بہت چوڑا مگر جس طرح ستلج ہر پتن کے بعد ایک لکیر کی طرح نظر آتا ہے۔ اسی طرح راوی دریا میں بھی اتنا ہی پانی بہہ رہا تھا۔

بس موٹروے نمبر۳ پر دوڑ رہی تھی۔ پاکستان کا موٹروے دنیا کی خوبصورت اور جدید سڑکوں میں سے ایک ہے۔ کہیں پر بھی کوئی رُکاوٹ نہیں۔ ٹریفک پانی کی طرح بہتی ہے۔ سڑکوں پر آوارہ جانوروں سے بچاؤ کے لیے تاریں لگائی گئی ہیں۔ جہاں پر سڑکیں علیحدہ ہوتی ہیں وہاں ٹول ٹیکس کا کمپوٹرائزڈ بندوبست ہے۔ بسوں اور کاروں کو آدھ منٹ بھی نہیں ٹھہرنا پڑتا۔ ان سڑکوں پر چلنے والی گاڑیوں سے ٹول ٹیکس وصول کیا جاتا ہے۔ مقامی ٹرانسپورٹر اسے بوجھ خیال کرتے ہیں۔

بس ۱۰۰کلومیٹر سے زائد رفتار پر چل رہی تھی، باہر سورج چمک رہا تھا۔ درجہ حرارت ۳۲،۳۰ سنٹی گریڈ ہوگا لیکن بس میں اے۔سی ہونے کی وجہ سے گرمی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ بس کے شیشے پردوں سے ڈھانپے ہوئے تھے لیکن میں اپنی سیٹ کا پردہ ہٹا کر باہر کا نظارہ کرتا جا رہا تھا۔ مشرقی پنجاب کی طرح ہر طرف گندم کے کھیت تھے۔ گندم پک چکی تھی اور کٹائی شروع تھی۔ مشرقی پنجاب میں تو زیادہ کٹائی کمبائن ہارویسٹر سے ہی کی جاتی ہے لیکن یہاں کسان ہاتھوں سے کٹائی کر رہے تھے۔ کٹائی کے عمل میں مردوں کے ساتھ کہیں کہیں عورتیں بھی ہاتھ بٹا رہی تھیں۔ عورتوں کا جگمگاتا سا لپٹا نظر آجاتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ کٹائی کے وقت بھی پردے کا خیال رکھتی ہیں۔ کھیتوں میں ٹیوب ویل بھی نظر آرہے تھے مگر زیادہ تر ٹیوب ویلوں کے ساتھ تیل والے انجنوں کا شبہ ہوتا تھا۔ کیوں کہ بجلی کے کھمبے نہ ہونے کی وجہ سے وہاں بجلی کی موٹریں لگی ہونے کا امکان نہیں تھا۔

باہر کے نظاروں سے محظوظ ہوتے پتہ ہی نہ چلا کہ کب فیصل آباد آ گیا۔ ڈیڑھ دو گھنٹے کا ایک پلک جھپکتے گزر گیا۔ بس سے اُتر کر ہمیں کچھ دیر بس سٹاپ پر رُکنا پڑ گیا کیونکہ

طارق کا دوست کار لیے دوسری سڑک پر انتظار کر رہا تھا۔ سڑک پر ٹریفک کا بہت رش تھا مگر پیدل چلنے والوں کے لیے سڑک کے دونوں طرف اونچی پیٹڑیاں بنائی گئی تھیں۔ ہر شخص ہماری طرف دیکھتے ہوئے گزر رہا تھا۔ لوگوں کی نظروں کو بھانپتے ہوئے ندیم آہستہ سے کہنے لگا ''سیکھا، کیا بات ہے، یہ سب تمہاری طرف ہی دیکھ رہے ہیں۔''

''ہرنوں کی ڈار کی طرف دیکھنے والوں کا دھیان سب سے پہلے بارہ سنگھے کی طرف ہی جاتا ہے۔'' میں نے اپنی علیحدہ شناخت کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ویسے بھی لوگوں کی نظروں سے یہی محسوس ہوا کہ یہاں سکھ کبھی کبھار ہی آتے ہیں۔ لوگوں کی نگاہوں نے میرے اندر بے چینی سی پیدا کر دی تھی اور میں وہاں کھڑے ہونے میں مشکل محسوس کر رہا تھا۔ اتنے میں طارق کا دوست عنایت اللہ عاجز اپنے ڈرائیور دوست محمد کو لے کر آ پہنچا۔ اُن سے مل کر فوراً ہی ہم ندیم پر مار کے جنم گاؤں رسیانہ کے لیے روانہ ہو گئے۔ رسیانہ کا اصل نام ''رئیس آنہ'' ہے۔۔۔ کار میں بیٹھے ہوئے ہم فیصل آباد کی کھلی سڑکیں، کھلے بازار اور اونچی عمارتوں کو دیکھتے ہوئے اس کی امیری کی جھلک محسوس کر رہے تھے۔

کار فیصل آباد سے نکلی تو ساندل بار کی دھرتی کا لاہور سے ذرا مختلف نظارہ دیکھنے کو ملا۔ راستے میں اونٹوں کی قطاریں نظر آ رہی تھیں۔ کھیتوں کے کنارے کیکروں، سفیدوں، سرکنڈوں اور ٹاھلیوں کے ساتھ ساتھ بن، جنڈ اور کریر جھنڈ بھی نظر آ رہے تھے۔ بار کا یہ علاقہ پچاس کی دھائی کا مالوے کا علاقہ لگتا تھا۔ بٹھنڈے کے علاقے کی زیادہ تر دھرتی تو اب بھی اس علاقے جیسی ہی لگتی ہے۔

ہر طرف پکی ہوئی گندم کی فصل تھی جو کٹائی کرنے والوں کے انتظار میں کھڑی محسوس ہوتی تھی۔ کسی کسی کھیت میں گندم کی کٹائی ہو بھی رہی تھی۔

سڑک اچھی حالت میں تھی اس لیے دوست محمد اسے ۶۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دوڑائے جا رہا تھا۔

''آپ ایک دوسرے کو کب سے جانتے ہیں۔'' طارق گوجر نے ندیم پر مار سے

پوچھا تو میرا دھیان بیرونی نظاروں کے بجائے اُن کی باتوں کی جانب ہوگیا۔ ’’جب سے کینیڈا میں آئے ہیں۔تقریباً گیارہ سال ہوگئے ہوں گے۔‘‘ ندیم پرمار نے جواب دیا۔

’’قلم کا رشتہ پہلے ہی تھا، یہی رشتہ بعد میں دوستی میں تبدیل ہوگیا۔‘‘ میں نے بھی اُن کی گفتگو میں حصہ دار بنتے ہوئے کہا ’’جی ہاں قلم کا رشتہ خون کے رشتوں سے بھی زیادہ ’’نکھا‘‘ اور بڑا ہوتا ہے۔ طارق نے کہا ’’آج ہم یہ رشتہ آپ کے ساتھ بھی جوڑ رہے ہیں۔‘‘ ندیم پرمار نے کہا ’’ان رشتوں کے سامنے مذہب اور نسل کے رشتے ہیچ نظر آتے ہیں۔‘‘ عنایت بھی ہماری باتوں میں شامل ہوگیا۔

اسی طرح کی باتیں کرتے کرتے طارق کا جنم قصبہ ’’ڈجکوٹ‘‘ آ گیا۔اُس نے دوست محمد سے کہا ’’اگلے چوک سے بائیں طرف مڑنا ہے۔‘‘

طارق گوجر کی آج کل رہائش لیہ (مظفرگڑھ کے پاس) ضلع میں ہے لیکن اُس کے چچا چودھری عبدالرشید کی رہائش ڈجکوٹ میں ہے۔ وہ سمندری شہر میں بینک

رُکوانے کا سبب پوچھا تو اُس نے بتایا ’’اس پل کو سلونی جھال کہتے ہیں۔ہم لڑکپن میں کبھی کبھی یہاں تانگوں یا گھوڑوں پر آیا کرتے تھے۔ پل سے دور گرمیوں میں نہایا کرتے تھے۔ اب میں یہاں کھڑا اپنے بچپن کے اُن دِنوں کو تلاش کرر ہا تھا۔‘‘

ندیم پر مار کی اس بات نے مجھے بھی اپنا بچپن یاد کروا دیا جب روڈیاں والے سکول سے واپسی پر ہم سرہند نہر میں اُلٹی سیدھی تاریاں لگایا کرتے تھے اور گھر جا کر والدین سے جھڑکیاں سنا کرتے تھے۔

کار سڑک پر دوڑی جارہی تھی اور ہمارا بچپن جو ہم سے ۵۷ برس پیچھے رہ گیا تھا ہمارے ساتھ ساتھ دوڑ رہا تھا۔ہم باہر کے نظاروں کو بھول کر اپنے بچپن کے نظاروں میں گم تھے۔ پتہ ہی نہ چلا کب سمندری شہر آ گیا۔

سمندری شہر میں کوئی زیادہ رونق نہ تھی۔سڑکیں خالی اور اُداس سی نظر آئیں۔اسی اثناء میں مجھے سکھوں کی مہان شخصیت ’’تیجا سنگھ سمندری‘‘ یاد آ گئے جنہوں نے اس علاقے میں پہلی خالصہ دیوان سوسائٹی بار بنائی تھی اور لائل پور میں پہلا خالصہ کالج شروع کیا تھا۔ آج اُن کے نام پر امرتسر کے دربار صاحب (گولڈن ٹیمپل) میں تیجا سنگھ سمندری ہال بنا ہوا ہے۔اُن کے بیٹے بشن سنگھ سمندری گرونانک دیو یونیورسٹی امرتسر کے وائس چانسلر ہو گزرے ہیں۔میں یہ سوچ رہا تھا کہ کیا یہ شہر اُن کے زمانے میں بھی ایسا ہی اُداس ہوگا یا پھر میری اپنی اُداسی ہی شہر کی رونقیں نہیں دیکھ پا رہی تھی۔ ہماری کار ہائیر سکینڈری سکول کے پاس آ کر رُک گئی۔ندیم بائیں طرف اشارہ کر کے کہنے لگا ’’یہ میرا سکول ہے جہاں میں پانچویں اور چھٹی میں پڑھا کرتا تھا۔یہی وہ درخت ہیں جہاں ہم گھوڑی باندھا کرتے تھے۔اس طرف جماعتیں بیٹھتی تھیں۔‘‘ وہ اپنے بچپن میں کھو گیا تھا۔اُس کی آنکھوں میں پرانے منظر گھوم رہے تھے۔

عنایت اللہ عاجز نے اپنا ویڈیو کیمرہ ٹھیک کروانا تھا۔وہ کار سے اُتر کر ویڈیو شاپ کے اندر چلا گیا۔کاونٹر پر کوئی نہ تھا۔میں اور ندیم بھی اندر آ گئے۔اندرورکشاپ میں دونو جوان

بیٹھے تھے اور عنایت ان کے پاس کھڑا کیمرہ درست کروا رہا تھا۔ ہمیں دیکھ کر دکاندار ورکشاپ سے باہر آ گیا۔ وہ ہمیں بڑی گرمجوشی اور اپنائیت سے ملا۔ آئیں بیٹھیں سردار جی، بہت خوشی ہوئی آپ ہمارے شہر آئے۔ تیس سال کی عمر کا گھبرو کاونٹر کا دروازہ کھول کر ہمیں کرسیوں پر بیٹھنے کے لیے کہہ رہا تھا۔

''مہربانی بس کھڑے ہی ٹھیک ہیں۔'' میں نے اُس کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔

''ہم بہت جلدی میں ہیں۔ اگر وقت ملا تو واپسی پر ضرور کچھ دیر ٹھہریں گے۔ طارق گوجر دکان سے باہر پیر کھسکاتے ہوئے بولا۔

''گرمی بہت ہے ٹھنڈا تو پیتے جائیں۔'' دکان دار نے بیٹھنے کے لیے دوبارہ اصرار کیا۔

''واپسی پر۔'' عنایت اللہ عاجز صاحب یہ کہتے ہوئے دُکان سے باہر آ گئے۔ کیمرے کا کوئی بٹن ہی غلط دبا دیا گیا تھا جسے مکینک نے پلک جھپکتے میں ہی ٹھیک کر دیا۔ ہم بھی دُکان دار سے ہاتھ ملا کر باہر آ گئے۔ دکان سے نکلتے ہوئے ندیم نے ایک طرف ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے کہا ''یہ سڑک ٹوبہ ٹیک سنگھ کو جاتی ہے۔''

ٹوبہ ٹیک سنگھ کا نام سنتے ہی میرے سامنے منٹو کی کہانی ٹوبہ ٹیک سنگھ اور اس کہانی پر ڈاکٹر آتم جیت سنگھ کا لکھا اور کھیلا گیا۔ ناٹک ''رشتیاں دا اک رکھیے ناں'' کے کردار آ گئے۔ اس علاقے میں چلتے پھرتے میری سوچ نے کچھ یوں رُخ بدلا کہ میں سوچنے لگا ''کیا اُس دور کے سیاستدانوں سے زیادہ اُس پاگل خانے کے پاگل سیانے نہیں تھے؟''

کار اب رسیانہ کی طرف جا رہی تھی۔ ندیم پر مار دائیں طرف ہاتھ کر کے بتا رہا تھا ''یہ پرائمری سکول ہوتا تھا۔''

''اب یہ پولیس سٹیشن بن چکا ہے۔'' طارق گوجر نے بتایا۔

''ہاں وقت کے حاکموں کو سکولوں کی بجائے تھانوں کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔'' یہ الفاظ میرے ہونٹوں پر آ کر رُک نہ سکے۔

''یہ سڑک 'ناراڑاڈ' کو جاتی ہے یہ گاؤں مشہور فلمی میوزک ڈائریکٹر غلام محمد کا ہے۔'' ندیم پرمار بتا رہا تھا۔

دوست محمد نے کار گوجرہ جانے والی سڑک پر ڈال دی۔ ندیم پرمار کو لگا کہ جیسے یہاں سے ہم غلط راہ پر آ گئے ہیں۔ اس چوک میں سے ایک سڑک دائیں طرف کو اور ایک بائیں طرف کو جا رہی تھی۔ سمندری شہر کے اِردگرد کی نئی بستیوں نے ندیم پرمار کو غلط فہمی میں ڈال دیا تھا۔ شک دور کرنے کے لیے گدھوں پر اینٹیں لاد کر جاتے ہوئے ایک آدمی سے پوچھا تو اس نے کہا کہ آپ لوگ ٹھیک جا رہے ہیں۔ پھر بھی ندیم پرمار کو سب کچھ بدلا بدلا لگ رہا تھا۔ میں نے بتایا کہ میں اس دفعہ دو سال کے وقفے کے بعد اپنے گاؤں گیا تھا۔ مجھے بھی اپنا گاؤں بدلا بدلا محسوس ہو رہا تھا۔ تم تو ۵۸ سال بعد واپس آئے ہو۔ ۵۸ سال بعد پرانی تصویر کے رنگ پہلے جیسے نہیں تھے۔

جب ہماری کار چک نمبر ۱۳۷ کے پاس پہنچی تب ندیم پرمار کو یقین ہو گیا کہ ہم ٹھیک راستے پر ہیں۔ اُس نے بائیں جانب اشارہ کرتے ہوئے بتایا ''اس سارے گاؤں کا مالک دلیپ سنگھ ڈھلوں ہوا کرتا تھا۔ اُس کی اگلی نسل (پرتاب سنگھ) کیروں پروار سے ملتی تھی۔

اس گاؤں چک نمبر ۱۳۷ میں سڑک کے کنارے دو تین آدمی درختوں کے نیچے بیٹھے گپیں ہانک رہے تھے۔ کار روک کر اُن سے راستہ پوچھا تو اُن میں سے ایک نے بتایا کہ آپ یہاں سے چھوٹے رسیانے کے راستے بھی جا سکتے ہیں اور چک نمبر ۱۳۸ کے بورڈ کے ساتھ ہی سیدھی سڑک کے ذریعے بھی۔ اُن کا شکریہ ادا کر کے ہم نے گاڑی آگے بڑھا لی۔

جلد ہی سڑک کے دائیں طرف چک نمبر ۱۳۸ کا بورڈ نظر آیا تو ندیم پرمار کی آنکھوں میں عجیب سی چمک آ گئی۔ بچوں کی طرح اُچھل کر بولا ''یہ دیکھو ہمارے پنڈ کو جانے والا راستہ۔''

OOO

چک نمبر ۱۳۸

باروں کے علاقے میں سب سے پہلے مربع بندی ہوئی تھی (بار بے آباد میدانی علاقے کو کہا جاتا ہے پنجاب میں پانچ باریں تھیں۔ ساندل بار، نیلی بار، گنجی بار، کڑانہ بار وغیرہ) جب اس علاقے میں نہروں کا جال بچھا دیا گیا تو اسے چکوک میں تقسیم کر دیا گیا۔ چکوک کے نام نہروں کے نام پر رکھ دیے گئے۔ جیسا کہ اس علاقے میں چلنے والی نہر گوگیرہ برانچ کے سیرابی علاقے میں سو، سوا سو مربعے (۱۲۵ ایکڑ زمین کا ٹکڑا مربع کہلاتا ہے) کا ایک چک بنا دیا گیا۔ اسی حساب سے چک نمبر کے ساتھ گ۔ب لگا دیا گیا۔ مثلاً چک نمبر ۱۳۸ گ۔ب (ان چکوک نام بعد میں رکھے گئے مشرقی پنجاب اور شمالی پنجاب سے آنے والے پنجابیوں نے اپنے پرانے گاؤں کے ناموں پر رکھے) اُس زمانے میں انگریزوں نے ان باروں کو آباد کرنے کے لیے پورے پنجاب سے لوگوں کو یہاں لا بسایا تھا۔ یہاں پر سستی زمین اور سرکاری سہولتیں ہونے کی وجہ سے پنجاب کے گنجان آباد ضلعوں سے کسانوں نے آ کر زمینیں لیں۔ ندیم پرمار کے نانا سردار مان سنگھ سروآ ہوشیار پور کے گاؤں دیہانہ سے آ کر چک نمبر ۱۳۸ گ۔ب رسیانہ میں زمین خریدتے گئے اور آہستہ آہستہ

گاؤں کے بڑے حصے کے مالک بن گئے۔ آج ہم اس چک نمبر ۱۳۸ کے دروازے پر کھڑے تھے۔

دوست محمد نے کار چک نمبر ۱۳۸ اگ۔ب کے موڑ پر روک لی۔ ہم سب کار سے نیچے اُتر آئے۔ ندیم پرمار نے آہستہ سے نیچے جھکتے ہوئے جیسے اپنے جوتے میں سے کوئی کنکر نکالنے لگا ہو، دھرتی پر سے مٹی کی چٹکی لی اور اپنے ماتھے پر لگالی۔ میں نے سڑک پر لگے بورڈ چک نمبر ۱۳۸ اگ۔ب کی تصویریں لیں۔ عاجز اِردگرد کے مناظر دیکھنے میں محو تھا۔ کچھ دیر بعد بولا۔ بہت کچھ بدل گیا ہے، بہت کچھ۔۔۔

آدھی صدی سے زیادہ وقت گزر گیا۔ چیزیں اُسی جگہ کیسے رہ سکتی ہیں۔ اپنی طرف ہی دیکھ لو، جب یہاں کھیلا کرتے تھے تو چھوٹے سے جُوڑے والے بچے ہی تھے اور آج چٹی داڑھی والے بابے ہو۔ مگر ندیم چپ چاپ گاڑی میں بیٹھ گیا۔ شاید اسے احساس ہو گیا کہ ابھی دس منٹ قبل ہی سمندری میں وہ کہہ چکا ہے کہ سب کچھ بدلا بدلا لگتا ہے۔ ہمیں واپس جانے کی بھی جلدی تھی چنانچہ ہم نے گاڑی رسیانے کے راستے پر ڈال دی۔ سڑک کے بائیں جانب بہت بڑا پولٹری فارم تھا۔ پولٹری فارم تین چار ہزار پرندوں کی گنجائش کا لگتا تھا۔ سمندری سے آتے وقت راستے میں بہت سے پولٹری فارم نظر آئے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ اس علاقے کے لوگوں کا یہ اہم کاروبار تھا۔ سڑک چھوٹے رسیانے پہنچی تو دونوں طرف روڑیوں کے ڈھیر (گوبر اور کوڑا کرکٹ) لگے نظر آئے۔ گاؤں چھوٹا سا تھا۔ کچھ مکان کچے بھی تھے۔ جو پکے تھے انہیں بھی سیمنٹ کا پلستر نہیں کیا گیا تھا۔ پکی حویلیاں تھیں جن پر چوبارے بنے ہوئے تھے۔ سڑک کے کنارے کیکر، شیشم اور سُوکن کے درخت تھے۔ سڑک کے اِردگرد کیلے کے جھنڈ بھی نظر آ رہے تھے۔ سڑک کے دائیں طرف درختوں کے جھنڈ سے نظر آئے۔ غور سے دیکھا تو باغ نظر آئے۔ ندیم پرمار نے بتایا کہ یہ باغ تو بہت پرانا ہے، اُس کے زمانے میں بھی ہوتا تھا۔

سڑک پر کئی ریڑھے پکی اینٹیں لادے بڑے رسیانے کی طرف جا رہے تھے دو

گڈے ہرا چارہ لے کر بھی گزرے۔ یہ گڈے لمبوترے اور سادہ سے جُولوں والے تھے۔ انہیں دو دو بیل کھینچ رہے تھے۔ یہ گڈے ساٹھ کی دہائی میں مالوے کے علاقے میں لکڑ ڈھونے والے گڈوں کے مشابہہ تھے۔ گڈے بیل دیکھ کر لگتا تھا جیسے تیس پینتیس سال پہلے کا مشرقی پنجاب ہو۔ مغربی پنجاب کے گاؤں اس کے شہروں کے مقابلے میں ابھی بہت پسماندہ لگتے تھے۔

بڑا رسیانہ پہنچے تو درمیان میں ایک چوک نظر آیا۔ دائیں طرف سمندری سے ایک کار آ رہی تھی۔ رستہ نیم پختہ سا تھا۔ دوست محمد نے اپنی کار ایک طرف کر لی دوسری کار دھول اُڑاتی آ رہی تھی۔ کار گزرنے کے پانچ چھ منٹ بعد تک دھول اور غبار چھایا رہا۔

شریف آدمی دو چار منٹ کی بچت کے لیے ہر چیز کو دھول میں لپیٹے جا رہا ہے۔ خود بھی مصیبت میں ہے اور دوسروں کو بھی مصیبت میں ڈال رہا ہے۔ دوست محمد کا اس طرح کا تبصرہ ہم نے پہلی بار سنا۔ وہ بہت کم بولتا تھا۔ ریز رو طبیعت والا لگتا تھا، کوئی بات کرتا بھی تو عنایت اللہ عاجز سے ہی کرتا۔ اُس کا دھیان کار چلانے کی طرف ہی رہتا تھا۔

جب رسیانہ پہنچ گئے تو یہاں بھی ندیم پرمار کو لگا کہ یہ پہلے والا رسیانہ بالکل نہیں۔ جس چوگان میں ہم پہنچے تھے ندیم کے بقول وہاں گردوارہ ہوتا تھا۔ جس طرح اُجاڑے کے وقت مشرقی پنجاب میں لوگوں نے مسجدیں شہید کر کے اُن کی جگہ گردوارے بنا لیے تھے یا قبضہ کر کے مکان تعمیر کر لیے تھے اسی طرح مغربی پنجاب میں گردوارے شہید کر کے کہیں تو مسجد بنا لی گئی تھی اور کہیں ویسے ہی قبضہ کر لیا گیا تھا۔

اس گاؤں میں بھی لوگوں نے گردوارہ شہید کر کے اُس کی جگہ کو اپنے اپنے گھروں کے ساتھ ملا لیا تھا۔ گردوارے کے پاس ہی پیلوں اور برگدوں کی ایک جھنگی ہوتی تھی جہاں گرمیوں میں گاؤں کے لوگ بیٹھتے اور ساتھ ساتھ اپنے چھوٹے موٹے کام بھی کر لیتے۔ پیلوں اور برگدوں کی جگہ بھی گھر بن گئے تھے۔ اسی وجہ سے ندیم پرمار کے من میں بسا ہوا رسیانہ پہچانا نہیں جا رہا تھا۔

جس رسیانے کو میں دیکھ رہا تھا وہ اگر چہ کہنے کو بڑا رسیانہ تھا مگر تھا چھوٹا سا گاؤں ڈیڑھ سو گھر ہوں گے۔ زیادہ سے زیادہ دو سو۔

مکان پکی اینٹوں کے تھے مگر اکثر پلستر کے بغیر۔ گھر کھلے کھلے تھے ہر گھر کے آگے ٹوٹے پھوٹے گڈے (لمبوترے، سیدھے جولے والے اور لوہے کے جال کے بغیر تویت، گڈوں کے اطراف نہ ہی جوف نہ ہی پنجنیاں) کھڑے تھے۔

البتہ میں نے اس گاؤں میں پہلی بار بڑی ٹریکٹر ٹرالی دیکھی۔ ٹرالی کو دیکھ کر لگتا تھا کہ جیسے اس گاؤں میں ۵۰، ۵۷ ہارس پاور والے ٹریکٹر بھی ہوں گے گہائی کا موسم ہونے کی وجہ سے ایک گھر کے باہر نئی تھریشر لاکر کھڑی کی گئی تھی۔ گاؤں کی گلیاں بھی بہت کھلی تھیں۔

ہم کار روک کر گاؤں کے چوگان (مرکزی چوک) میں آ گئے۔ ایک شخص سے سکول کا رستہ پوچھا تو اس نے سیدھے جانے کو کہا۔ کار کا رُخ اس جانب کیا تو چند قدم آگے سکول تھا۔ سکول دیکھ کر ندیم پرمار کی خوشی دیدنی تھی، وہ کار سے چھلانگ لگا کر اُترا اور کہنے لگا ''لے وئی آ گیا میرا سکول'' یہ پرائمری سکول تھا۔ پتہ چلا کہ اب یہاں ہائی سکول بھی بن گیا ہے۔ ہائی سکول گاؤں کی دوسری جانب تھا۔ چھٹی ہونے کی وجہ سے سکول بند تھا۔ اِرد گرد بھی کوئی نہ تھا۔ عنایت اللہ عاجز، طارق گوجر سے کہنے لگا طارق، یہ سامنے والے گھر میں ٹوکہ چلتا لگتا ہے وہیں سے کسی کو بلاؤ۔

اتنی دیر میں وہاں کھڑی کار اور پگ والے آدمی کو دیکھ کر دو تین چھوٹے بچے ہمارے پاس آ گئے۔ میں نے اُن میں سے ذرا بڑے لڑکے سے کسی سیانے بندے کو بلا لانے کے لیے کہا مگر وہ ہمیں دور سے ہی گھورتے رہے، نہ اُن میں سے کوئی بولا نہ ہی وہاں سے کوئی ہلا۔

ندیم پرمار مجھے بتا رہا تھا کہ سکول کے لیے زمین میرے نانا نے ہی دی تھی اگر چہ وہ کھیتی کے ساتھ ساتھ ساہوکار بھی تھے۔ مگر کھلے دِل والے تھے گردوارے کے لیے بھی انہوں نے بہت مدد کی تھی۔ اسی لیے یہاں بہت ہی خوبصورت گردوار بن گیا تھا۔ سامنے

شمال کی طرف ہمارے مربع تھے۔ میرے نانا کے پاس رہن کے کئی مربعے بھی تھے، جنہیں وہ اُن کے مالکوں کو ہی کاشت کے لیے دے دیتے۔

اتنی دیر میں طارق ایک آدمی کو لے کر ہمارے پاس آ گیا۔ وہ ہمارے بارے میں اُسے پہلے ہی بتا چکا تھا۔ وہ ہمیں جپھی ڈال کر ملا اور گاؤں آنے پر ہمیں ''جی آیاں نوں'' کہا۔ پھر اُس نے اُسی لڑکے کا نام لے کر (جسے ہم پہلے کسی کو بلانے کے لیے کہہ چکے تھے) کہا'' گاؤں میں جو ٹیچر رہتا ہے اُسے بلا کر لے آ، اگر وہ گھر نہ ہو تو سکول کی چابی لے آنا۔'' اُس شخص کے کہنے پر دو لڑکے فوراً چل پڑے۔ پھر وہ شخص طارق گوجر سے باتوں میں لگ گیا۔ عنایت اللہ عاجز اِردگرد کی مووی بنانے لگا۔ ندیم پرمار باہر ہی سے سکول کے کمروں اور ساتھ والے چھپڑ کے فوٹو لینے لگا۔ اُس نے مجھے بتایا'' اس جگہ برگد اور یہاں پیپل ہوتا تھا۔ ہم ان درختوں کی چھاؤں میں کھڑے ہو کر پہاڑے بولا کرتے تھے۔ یہ چھپڑ جیسا پہلے تھا اب بھی ویسا ہی ہے۔ فرق صرف یہ پڑا ہے کہ راستے کے ساتھ ساتھ پکی دیوار بنا دی گئی ہے۔ برگد اور پیپل کے نیچے ٹیچر کلاس بھی لگا لیا کرتے تھے۔ چھٹی کے بعد ہم یہاں ہی کھیلنے لگ جاتے۔ کمروں کی پچھلی جانب سے آ کر چھپڑ پر تختیاں پوچا کرتے تھے۔ ماسٹر بھجن سنگھ سمندری سے آیا کرتے تھے اور ماسٹر فضل دین چک نمبر ۱۲۰ سے۔ دونوں سائیکلوں پر آتے۔ ہم ضد کر کے اُن سے سائیکل پکڑتے اور صاف کیا کرتے تھے۔''

ندیم پرمار سکول کی چار دیواری کے اوپر سے کمروں کو دیکھتا ہوا ہمیں اپنی یادوں میں شامل کر رہا تھا۔ اب وہ جلدی سے سکول میں داخل ہو کر وہ جگہیں دیکھنا چاہتا تھا جہاں بیٹھ کر وہ چوتھی جماعت تک پڑھتا رہا تھا وہ اُن دو کمروں کو بھی اندر جا کر دیکھنا چاہتا تھا جو اُس کی آنکھوں کے سامنے تعمیر ہوئے تھے اور پھر اُس نے اُن کمروں میں بیٹھ کر پڑھا بھی تھا افسوس کہ لڑکے خالی ہاتھ واپس ہوئے۔ سکول ٹیچر کہیں گیا ہوا تھا اور اُس کے گھر والوں نے لڑکوں کو چابی دینے سے انکار کر دیا تھا۔ ہم نے چار دیواری کے ساتھ سکول کا چکر لگایا۔ اوپر سے سکول میں جھانکا اور واپس ہو لیے۔ ندیم پرمار کے پیر آہستہ آہستہ پیچھے کو کھسک رہے

تھے جیسے وہ یہاں اپنا کچھ چھوڑ کر جا رہا ہو یا جیسے اُس کی کوئی گمشدہ چیز اُسے نہ مل سکی ہو۔ مایوسی سے ہم کار میں آ بیٹھے۔ دوست محمد نے اب کار کو رسیانے کے اس گھر کی جانب کرلیا جہاں ندیم پر مار نے جنم لیا تھا۔ کار ایک بہت چوڑی گلی میں موجود ایک بڑے سے مکان کے سامنے آ رُکی۔ اُس گھر کے سامنے گلی کی دوسری جانب بھی بہت بڑا اور خوبصورت مکان بنا ہوا تھا۔ ہم کار سے اُتر کر اُس مکان کی چھاؤں میں آ کھڑے ہوئے۔

ہمارے ساتھ آیا گاؤں والا شخص ابھی اِردگرد کسی کو تلاش کر رہا تھا کہ ایک بیس اکیس سالہ نوجوان ہمارے پاس آ گیا۔ اُس نے پینٹ اور ٹی شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ وہ کسی کالج کا سٹوڈنٹ لگتا تھا۔ ہم سے ہاتھ ملا کر کہنے لگا ''میں آپ کو گھر والوں سے ملوا دیتا ہوں۔'' اُس کی باتوں سے شہری ہونے کا شبہ ہوتا تھا۔ اُس نے اپنے ساتھی سے کہا جاؤ ڈاکٹر صاحب گھر ہی ہوں گے انہیں بلا کر لاؤ۔''

اُس لڑکے نے اونچے ڈاٹ والے دروازے پر دستک دی۔ کچھ دیر کے بعد دروازے کی چھوٹی کھڑکی کھلی اور پھر بند ہوگئی، اِدھر مجھے ندیم پر مار بتا رہا تھا۔ ''بھرتی ڈال کر یہ گلی بہت اُونچی کر دی گئی تھی۔ یہ بائیں طرف والی بیٹھک وہی ہے جو میرے نانا نے بنوائی تھی، لگتا ہے اس کی چھت بعد میں اونچی کی گئی ہے۔ دائیں طرف کا مکان سارا ہی گرا کر دوبارہ بنایا گیا ہے۔ وہاں سامنے کنواں ہوتا تھا جس کا پانی کھارا ہوتا تھا وہ پانی کھانے پینے کے لیے استعمال نہیں ہوتا تھا اُس سے بس نہانے اور کپڑے دھونے کا کام لیا جاتا تھا۔ جانوروں کو بھی اسی سے پانی پلایا اور نہلایا جاتا تھا۔

یہ لمبا چوڑا مکان پلستر تو کیا گیا تھا مگر باہر سے رنگ روغن نہیں ہوا تھا دروازے کے ساتھ چھت پر پانی کی اونچی ٹینکی تھی۔ میں مکان کی بناوٹ دیکھ رہا تھا کہ کالجیٹ نظر آنے والے لڑکے کی آواز سنی ''ڈاکٹر صاحب کرلیں جانے کی تیاریاں، یہ مالک مکان آ گئے ہیں اپنا گھر سنبھالنے'' ''جی آیاں نوں'' بڑی خوشی سے سنبھال لیں۔'' کہہ کر وہ سادہ شلوار قمیص میں ملبوس شخص ہم سب سے باری باری جپھی ڈال کر بڑی گرمجوشی سے ملا۔ حال

چال پوچھنے کے بعد اُس نے ہمیں دو انتظار کرنے کے لیے کہا اور دوبارہ گھر کے اندر چلا گیا۔ ہمیں اجنبی جان کر چار پانچ پڑوسی ہمارے پاس آ گئے۔ بچے تو پہلے ہی وہاں جمع تھے۔ کچھ دیر بعد پرانی بیٹھک کے ساتھ والا دروازہ کھلا اور ہمیں اندر آنے کو کہا گیا۔ ہم چاروں گھر میں داخل ہو گئے۔ ہمارے ساتھ ہی وہ پانچ سات آدمی بھی تھے جو ہمیں دیکھ کر جمع ہو گئے تھے۔ پہلا کمرہ جس میں ہم داخل ہوئے ہال نما تھا جس میں اونی چٹائی بچھی ہوئی تھی یہ کمرہ نماز کے لیے مخصوص کیا گیا تھا۔ بائیں طرف آٹھ دس کرسیاں رکھی گئی تھیں۔ سب لوگ جوتے اُتار کر چٹائی پر بیٹھ گئے۔ ہم جوتے اُتارنے لگے تو ڈاکٹر صاحب نے کہا ''جوتے اُتارنے کی ضرورت نہیں آپ اِدھر کرسیوں پر تشریف رکھیں۔'' اس کمرے میں ہم نے گاؤں والوں سے دو تین منٹ باتیں کیں۔ گاؤں میں ۴۷ء سے پہلے کا رہائشی کوئی ایک بھی نہ تھا۔ سب بعد میں یہاں آ کر بسے تھے۔ زیادہ تر لوگ ہوشیار پور سے اُجڑ کر یہاں آ بسے تھے۔ باتوں کا سلسلہ چلتا رہتا اگر ڈاکٹر صاحب ہمیں وہاں سے اُٹھا کر ایک اور کمرے میں نہ لے جاتے۔ انہوں نے گاؤں والوں سے وہیں ٹھہرنے کو کہا۔ ہم چاروں ڈاکٹر صاحب اور اُن کے تایازاد کے ساتھ ایک اور کمرے میں آ گئے اس کمرے میں جانے کے لیے ہمیں سات آٹھ سیڑھیاں نیچے اُترنا پڑا، یہ کمرہ گھر والوں نے اُسی پرانی حالت میں سنبھال کر رکھا ہوا تھا تاکہ گھر کے اس حصے کا وہی پرانا ماحول برقرار رکھا جا سکے۔ گھر کے باقی حصے کو گرا کر انہوں نے انگریزی لفظ "U" کی شکل دے دی تھی۔

گھر کا صحن بہت کھلا تھا۔ صحن کے وسط میں چھوٹا سا باغیچہ لگایا گیا تھا جس میں قسم قسم کے پھول دار پودے لگے ہوئے تھے۔ ایک نکر میں پرانی بیری کا درخت ویسے کا ویسا کھڑا تھا۔ دروازے کے سامنے ایک طرف ایک جیپ کھڑی تھی۔ میں نے کمرے میں داخل ہوتے وقت گھر کا طائرانہ جائزہ لے لیا۔ ہمیں صوفوں پر بیٹھنے کے لیے کہا گیا۔ ساتھ ہی کوکا کولا پینے کے لیے دے دی گئی۔

مشروب کے بعد ڈاکٹر صاحب نے اپنے خاندان کے متعلق بتایا وہ بھی راجپوت

گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ اُن کے والد چودھری عدالت خاں ولد سندے خاں ہشیار پور کے مشہور گاؤں ریہانہ جٹاں کے نزدیکی گاؤں ککوں سے اُجڑ کر اِدھر آئے تو انہیں ندیم پرمار کے نانا سردار مان سنگھ سروآ والا گھر اور اُن کی زمین الاٹ ہوئی۔ یہ تین بھائی ہیں۔ رانا افتخار خاں، ڈاکٹر رانا محمد سرور خاں اور ڈاکٹر رانا محمد حیات خاں۔ تینوں بھائی ہی اچھے تعلیم یافتہ ہیں۔ ایک پی۔ ایچ۔ ڈی ہیں اور کسی محکمے میں ڈپٹی ڈائریکٹر ہیں۔ ایک بھائی نے ویٹرنری کی ڈگری حاصل کر رکھی ہے۔ وہ جانوروں کے ایک بڑے ہسپتال میں ڈاکٹر ہیں۔ ایک بھائی لاء کر کے سمندری میں وکالت کر رہے ہیں اُن کی والدہ کی خواہش تھی کہ گھر کو اسی حالت میں رہنے دیا جائے۔ اس خواہش کی بھی ایک وجہ تھی۔

ہشیار پور ضلع میں راجپوتوں جٹوں کے بہت سے گاؤں ہیں۔ ان گاؤں میں پرمار، پریہار اور چوہان گوت کے راجپوت بستے ہیں۔ ان میں سے بہت سوں نے اسلام قبول کر لیا۔ زیادہ تر سکھ دھرم میں شامل ہو گئے اور کچھ ہندو مذہب میں ہی رہے۔

جب انگریزوں نے پورے پنجاب میں سے کسانوں کو سہولتیں دے کر باروں کو آباد کرنے کا پروگرام بنایا تو ہشیار پور ضلع میں سے بھی بہت سے مسلمان اور سکھ راجپوت ادھر آ بسے۔ انہی میں ناراڈاڈا گاؤں کے مسلمان راجپوت زمیندار بھی تھے۔ انہوں نے لائل پور ضلع کی تحصیل سمندری میں زمین خریدی اور اپنے نئے گاؤں کا نام بھی ناراڈاڈا ہی رکھ لیا۔ اُس گاؤں میں زمین خریدنے والوں میں چودھری عدالت خاں کا ہم زلف بھی تھا۔ ندیم پرمار کا نانا بھی چونکہ اُسی علاقے سے آ کر بسا تھا اس لیے اس کا ناراڈاڈا اکثر آنا جانا رہتا۔ چودھری عدالت کی بیوی سروآ گوت سے تھی اس لیے ندیم کا نانا سردار مان سنگھ اُسے اپنی بہنوں کی طرح سمجھتا تھا۔

جب چودھری عدالت خاں سن ۴۷ میں یہاں آ گیا تو وہ پہلے پہل سمندری والے ناراڈاڈا میں اپنے ہم زلف کے پاس ہی ٹھہرا۔ اپنے ہم زلف کے کہنے پر چودھری عدالت خاں نے ندیم کے نانا کی جائیداد کو عارضی طور پر اپنی زیرِ نگرانی رکھ لیا۔ بعد میں یہی زمین اور

مکان اسے مستقل طور پر الاٹ کر دیے گئے۔

یہ کیسا رشتہ تھا کہ دونوں خاندان اُجڑ گئے اور لٹ پٹ کر دو الگ الگ دیسوں میں جا بسے تھے لیکن دِل میں اپنائیت اُسی طرح قائم تھی۔ چودھری عدالت خاں کی بیوی نے سروآ گوت اور سردار مان سنگھ کے علاقے کی بیٹی ہونے کی وجہ سے سردار مان سنگھ سرو کے اُس گھر کو اپنے میکے کی طرح سمجھا۔ جب کبھی وہ اُداس ہو جاتیں اور انہیں اپنی پچھلی دھرتی کی مہک ستاتی تو وہ اپنے بیٹوں سے یہ کہہ کر اپنا من ہلکا کر لیتیں ''اچھا ہوا مجھے یہاں آ کر بھی اپنا میکہ گھر ہی مل گیا۔ اگر کہیں اور زمین الاٹ ہو جاتی تو اس روہی بیابان (بار) میں دِن کاٹنے بہت مشکل ہو جاتے۔''

اس طرح انہیں اس گھر سے بھی اپنے میکے کی ہی مہک آنے لگی تھی جبھی تو انہوں نے اپنے بیٹوں سے کہا تھا ''اس گھر کو کبھی نہ گرانا اسے ایسے ہی سنبھال کر رکھنا۔''

نیک بیٹوں نے ماں کے حکم پر پھول چڑھائے تھے۔ گھر کے اس حصے کو اسی روپ میں باقی رکھا تھا۔ اس کمرے کی دیواریں بھی وہی چونے کے پلستر والی تھیں۔ دیواروں پر مور، فاختہ اور شیر کی تصویریں تھیں جن کا رنگ بہت اُداس ہو گیا تھا۔ دیواروں میں آلے اور کپڑے ٹانگنے کے لیے رنگین کلیاں وہی پرانی تھیں۔ اس کمرے میں بیٹھ کر کندھ چتر (دیوار پر تصویر) دیکھتے ہوئے یوں لگتا تھا جیسے ہم ضلع موگا کے گاؤں ماڑی مصطفیٰ میں بابا سِدھ کی ماڑی کے کسی کمرے میں بیٹھے ہوں۔ ہم نے اس کمرے کے فوٹو لیے اور پھر ندیم پرمار کے پرانے باغ کو دیکھنے چلے گئے۔

سردار مان سنگھ سروآ نے یہ باغ بڑے شوق سے لگوایا تھا۔ آموں کے بوٹے ہشیار پور سے لائے گئے تھے۔ کھٹیوّں اور نبوؤں (لیموں) کے بوٹے ہوتی (مردان) سے منگوائے گئے تھے۔ جہاں سے بھی کسی اچھے پھل دار بوٹے کی خبر ملتی، وہیں سے منگوا لیا جاتا۔ اس باغ سے ندیم پرمار کی بھی بہت سی یادیں وابستہ تھیں۔ سکول سے آ کر باغ میں کھیلنا، کبھی کبھار نانی کے ساتھ ناراض ہو کر باغ میں آ چھپنا اسے یاد آ رہا تھا۔ باغ میں داخل

ہوتے ہی سب سے پہلے ندیم کی نظر آم کے اس درخت پر پڑی جس پر پینگھ (جھولا) ہلارے لیا کرتی تھی۔آم کے اس درخت کو دیکھ کر اس نے جھٹ سے کہا اس کا ایک ٹاہنا (بڑی،موٹی شاخ) کاٹ دیا گیا ہے۔

''ہاں یہ ٹاہن تھوڑا سا نیچے جھک گیا تھا اور نیچے سے ٹریکٹر گزارنے میں دشواری ہوتی تھی۔اس لیے کاٹنا پڑا۔'' ڈاکٹر صاحب نے بتایا۔

باغ کی دوسری جانب اینٹوں کا بھٹہ بھی ہوتا تھا۔

''اس بھٹے کی جگہ کو ہموار کر کے ہماری ہوش سے پہلے ہی وہاں بوائی شروع کر دی گئی تھی۔''

''یہاں کہیں عنبوؤں کا ایک سدا بہار بوٹا ہوا کرتا تھا۔'' ندیم اپنی یادوں کے جھروکے میں سے دیکھتا ہوا پوچھے چلا جا رہا تھا۔

''جی ہاں وہ بوٹا ابھی بھی موجود ہے۔'' اور ڈاکٹر صاحب ہمیں عنبو کے اس بوٹے کے پاس لے گئے۔ بوٹے کے نیچے کھڑے ہو کر ہم نے ایک تصویر بنوائی اور آگے چل دیے۔ وہاں ایک پرانا شہتوت بھی تھا جو اب بہت بوڑھا ہو چکا تھا۔اُس پر پھل بھی کم لگتا تھا۔انہوں نے اُسے اُکھاڑا نہیں تھا بلکہ اُس کی قلمیں لگا کر اور بوٹے تیار کر لیے تھے۔اُس شہتوت کے پھل بہت میٹھے اور لمبے تھے آج کل شہتوتیوں کا موسم چل رہا تھا۔(شہتوتیاں شہتوت کے پھلوں کو کہتے ہیں) اس لیے نئے درختوں سے ہمارے کھانے کے لیے شہتوتیاں لائی گئیں۔اس کے علاوہ ساتھ لے جانے کے لیے بھی پلاسٹک کے لفافے میں ڈال کر دی گئیں۔شہتوتیاں اُنگلی بھر لمبی اور بہت ہی میٹھی تھیں۔شہتوت کے درختوں کے پاس ہی ڈاکٹر صاحب کے ماں باپ کی قبریں بنی ہوئی تھیں۔قبروں پر اُن کے ماں باپ کے نام، پرانے گاؤں کے نام اور وفات کی تاریخ لکھی ہوئی تھی۔بعد میں ندیم پرمار نے مجھے بتایا۔

''قدرت کی ستم ظریفی دیکھ! جس جگہ انہوں نے اپنے بزرگوں کو دفنایا ہے۔اسی جگہ پر میری بہن کو دفنایا گیا تھا۔وفات کے وقت اُس کی عمر چھ ماہ کے قریب تھی۔''

باغ میں انار، ﻋﺒﻨﻮ، گلگل، امرود اور کنو کے بوٹے لگے ہوئے تھے۔ ندیم نے اُن میں کوئی دلچسپی نہ لی۔ سارے باغ میں برسیم بیجا ہوا تھا۔ باغ سے کچھ ہی دور کیسو کا ایک بوٹا پھولوں سے لدا ہوا کھڑا تھا۔ اُس کے ساتھ ہی سوہانجنے کا ایک درخت بھی کھڑا تھا۔ ندیم پرمار اُس طرف اُنگلی کر کے کہنے لگا'' یہ درخت بھی پرانے ہی ہیں۔ اس وقت بھی کیسو کو ایسے ہی پھول لگا کرتے تھے اور پھول جھڑنے کے بعد یوں لگتا تھا جیسے نیچے بسنتی چادر بچھا دی گئی ہو۔'' ندیم پرمار کے اندر کا شاعر بول پڑا۔

ایک لڑکا دوڑ کر کیسو پر جا چڑھا اور پھولوں کی ایک ٹہنی توڑ کر لے آیا (ندیم اس ٹہنی کو سنبھال کر کینیڈا لے آیا ہے)

باغ کا چکر لگا کر ہم اُس گھر واپس آ گئے۔ چائے تیار ہو چکی تھی۔ چائے کے بعد ہم نے ندیم کے نانا کی لوہے کی مظبوط پیٹی دیکھی جس میں وہ اپنے ساہوکاری کے کاغذ پتر، نمبرداری کا مالیہ اور دوسری نقدی وغیرہ سنبھال کے رکھا کرتے تھے۔ اگرچہ نمبرداری اب بھی اسی گھر میں ہے لیکن وہ اس پیٹی کو اس کام کے لیے استعمال میں نہیں لائے۔ البتہ پرانے بڑے سائز کے تالے سمیت اس الماری کو سنبھال کر ضرور رکھا ہوا ہے۔ ہم نے اس پیٹی کے پاس کھڑے ہو کر تصویر بنوائی۔ گھر والوں کی لگ بھگ تین سال کی بچی کومل نے بھی ہمارے ساتھ کھڑے ہو کر تصویر بنوائی۔ جب تک ہم اس گھر میں رہے وہ ہمارے ساتھ ساتھ ہی رہی۔ ہم نے اُس کے ساتھ گھر کے باغیچے میں بھی فوٹو بنوائے۔ جب وہ پنجابی میں چھوٹی چھوٹی باتیں کرتی تو بہت پیاری لگتی۔

لوہے کی پیٹی دیکھ کر ہم اُس بیٹھک میں آ گئے جس میں ندیم پرمار بیٹھ کر پڑھا کرتا تھا۔ اس بیٹھک میں بھی ہمیں نیچے سیڑھیاں اُتر کر جانا پڑا۔ اس بیٹھک کو اندر سے پہلے والی پرانی حالت میں ہی سنبھال کر رکھا گیا تھا۔ یہاں تک کہ ایک الماری کے تختوں پر سیاہی سے لکھے ہوئے ندیم پرمار کے ماموؤں اور گھر کے دوسرے افراد کے نام بھی اُسی طرح موجود تھے۔ اُن میں ندیم پرمار کا نام کلونت سنگھ اُردو حروف میں لکھا ہوا تھا۔ اب یہ نام دھندلے

پڑ گئے تھے۔ہمیں ندیم کے نانا کی کرسی دیکھ کر بہت حیرانی ہوئی۔لگ بھگ ستر اسّی سال پرانی کرسی کوانہوں نے کسی یادگار کی طرح سنبھال کر رکھا ہوا تھااور بھی حیرانی اُس وقت ہوئی جب ہم نے پرانی دیوار کی ڈاٹ پرندیم کی نانی کا چرخہ دیکھا جسے بہت سنبھال کراحتیاط سے رکھا گیا تھا۔ ہرکوئی اپنے بزرگوں کی چیزیں تو یادگار کے طور پر سنبھال کر رکھتا ہی ہے مگر کسی بیگانے کی چیزوں کوسنبھال کر رکھنا خال خال ہی کسی کے حصے میں آ تا ہے۔اس گھر کے لوگوں کے آگےتو احترام سے سر جھکتا جا تا تھا۔

ہم گھر کی یاد کو سینوں میں سنبھال کر باہر آ گئے ۔ڈاکٹر صاحب بہت ضد کر رہے تھے کہ آج کی رات اُن کے پاس ٹھہرا جائے۔شام تک اُن کا وکیل بھائی بھی گھر آ جائے گا۔گاؤں کے اور معززین بھی بلا لیے جائیں گے۔مگر واپس جانا ہماری مجبوری تھی۔ہم نے ہاتھ جوڑ کر اُن سے جانے کی اجازت لی اور بوجھل دِل کے ساتھ وہاں سے چل پڑے۔

راستے میں ندیم پرمار رسیانے کی باتیں ہی کرتا رہا۔''جس مکان کی چھاؤں میں ہم پہلے جا کر کھڑے ہوئے تھے۔وہ بھی پہلے پکا ہوتا تھا۔مگر اب گرا کر بنایا گیا ہے۔اس کا کوئی حصہ بھی اب پہلے والا نہیں۔اس گھر کے ساتھ ہی ایک کوٹھڑی ہوتی تھی۔اُس میں ایک سنت رہا کرتا تھا۔میری نانی پہلی روٹی اسے بھیجا کرتی تھی۔وہ پہلی روٹی سنت کے پاس میں لے کر جایا کرتا تھا۔سنت مجھے بہت دُعائیں دیا کرتا تھا۔''اُس نے سنت کی بات چھوڑ کر اور بات شروع کر دی۔'' یہیں کرتار سنگھ آڑھتی کا مکان ہوا کرتا تھا۔وہ کھڑی گندم اور کپاس کے سودے کرلیا کرتا تھا۔فصل پکنے پر وہ گڈوں پر لاد کر گوجرہ منڈی لے جاتا تھا۔میرا نانا کبھی اُس کے ساتھ ایسا سودا نہ کرتا۔وہ خود فصل لے کر منڈی بیچنے جایا کرتا۔فصل زیادہ تر سمندری لے جا کر فروخت کرتا۔کبھی کبھار گوجرے کی منڈی بھی لے جاتا۔

اب تو مجھے کہیں برگد یا پیپل نظر ہی نہیں آیا۔اُس وقت گاؤں میں برگد اور پیپل کے بہت درخت ہوتے تھے۔گاؤں کے اس طرف جولاہے اپنی تانیوں کو پان دیا کرتے تھے۔''ندیم پرمار کی باتوں سے رسیانے کا پرانا نقشہ نمایاں ہو رہا تھا۔ہم بھی اُس کی باتیں

دلچسپی سے سن رہے تھے کہ سمندری شہر آ گیا۔ دِل تو چاہ رہا تھا کہ سمندری کے بازار میں گھوم پھر کر شہر کا نظارہ کیا جائے مگر سورج تھا کہ نیچے بھاگا جا رہا تھا۔ عنایت اللہ عاجز نے اپنے کچھ شاعر دوستوں کو گھر میں دعوت دے رکھی تھی۔ اس لیے بروقت فیصل آباد پہنچنا بھی ضروری تھا۔ اِدھر ڈجکوٹ میں طارق کے چچا کے گھر کھانا تیار تھا۔ گھر والوں کا دو دفعہ فون آ چکا تھا۔ اس لیے سمندری شہر کو کار میں سے ہی دیکھتے ڈجکوٹ کی طرف ہو لیے۔

طارق ڈجکوٹ کی تاریخ کے متعلق بتانے لگا'' ڈجکوٹ بہت پرانا شہر ہے کئی بار تباہ ہوا، پرانا کھنڈر شہر سے باہر ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہ شہر ڈچ لوگوں نے بسایا تھا۔ سب سے پہلے ادھر وہی لوگ آئے۔ انہوں نے یہاں قلعہ بنوایا اُسی قلعے کے نام پر شہر کا نام ڈچ کوٹ رکھا گیا جو بدلتے بدلتے ڈجکوٹ ہو گیا لیکن یہ روایت قابل اعتماد نہیں ہے کیونکہ ڈچ لوگوں کے ہندوستان یا پنجاب میں آنے کے متعلق کوئی دستاویز یا ٹھوس نشانی نہیں ملتی۔''

ڈجکوٹ کی وجہ تسمیہ بتاتے ہوئے ندیم نے کہا کہ بار کے علاقے میں اونٹ کو ڈاچ کہا جاتا ہے اور اونٹنی کو ڈاچی۔ جیسا کہ لوگ گیت ہے۔

'' ڈاچی والیا موڑ مہار وے، تیری ڈاچی دے گل وچ ٹلیاں، میں پیر مناون چلی آں۔'' اس علاقے میں اونٹ بڑی تعداد میں ہوتے تھے۔ اب بھی ہم نے راستے میں اونٹوں کی قطاریں جاتی دیکھی تھیں۔ ڈاچ سے بگڑ کے ڈچ اور ڈچ سے بدلتے بدلتے ڈج کوٹ نام مستعمل ہو گیا ہو گا۔

ڈجکوٹ کے نام کا چرچا جاری تھا کہ ہم گوگیرہ برانچ کے پل سلونی جھال پر پہنچ گئے۔ یہاں سایہ دار درختوں کے نیچے کار روک لی گئی نہر کا پاٹ بہت چوڑا ہے مگر نہر دور تک کچی ہی نظر آ رہی تھی۔ درختوں کے نیچے چائے وغیرہ کی چھوٹی چھوٹی دُکانیں بنی ہوئی تھیں ایک طرف درختوں کی چھاؤں میں کچھ مرد و زن، کھجور کی چٹائیاں بُن رہے تھے۔ پچاس کے عشرے کے بعد کھجور کی چٹائی دیکھنے کا میرا یہ پہلا موقع تھا۔ سن ۴۷ء سے پہلے مسلمان جولا ہے سرکنڈے کاٹ کر اُن کے پتوں سے چٹائیاں اور کھڑکیوں کے پردے وغیرہ بنایا کرتے

تھے۔ امیر لوگ خس کی چٹائیاں بھی تیار کرواتے تھے۔ انہیں خس کی چٹائیاں کہا جاتا تھا۔ گرمیوں کی رُت میں ان پردوں پر پانی کا چھڑکاؤ کیا جاتا تھا جس سے کمرے ٹھنڈے رہتے تھے۔ اُن کو چٹائی بنتے دیکھ کر فوٹو لینے کا ارادہ کیا۔ اُن سے پوچھا ہم آپ کی فوٹو لے سکتے ہیں۔ چٹائی بنانے والے کی بیوی فوراً وہاں سے اُٹھ کر ایک طرف ہوگئی اور بولی۔

''ہمارے یہاں عورتوں کی تصویریں نہیں لیتے۔''

عنایت اللہ عاجز اپنا مووی کیمرہ آن کر چکا تھا۔ اُس عورت کی ایک جھلک مووی کیمرے میں آ ہی گئی۔ اُس چٹائی میکر کی فوٹو لینے کے بعد ہم نے بھی سلونی جھال کے سامنے کھڑے ہو کر فوٹو کھچوائے اور ڈجکوٹ کے راستے پر ہو لیے۔ ڈجکوٹ پہنچے تو طارق کے چچا بینک سے چھٹی کے بعد گھر آ چکے تھے۔ طارق گجر کے تایا زاد چوہدری اسلم کسانہ سے بھی وہاں ملاقات ہوئی۔ وہ ڈجکوٹ کے معروف سیاسی وسماجی رہنما ہیں اور طور آئل ملز جہانگیر موڑ کے مینجنگ ڈائریکٹر ہیں۔

ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر اُن کے ساتھ بہت اچھی گفتگو ہوئی وہ بھی ہشیار پور ضلع سے اُٹھ کر یہاں آئے تھے۔ گفتگو کا موضوع پرانے علاقوں کی یادوں سے متعلق ہی تھا۔ کھانا بالکل تیار تھا اور ڈائننگ ٹیبل پر چن دیا گیا تھا۔ تازہ تازہ اور گرم پھلکے (ہلکی روٹیاں) ساتھ ساتھ تیار ہو کر پہنچنے لگے تھے۔ سو ہم نے بڑے مزے سے کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد ہم فیصل آباد کے لیے تیار ہوئے تو طارق کے چچا نے رات ڈجکوٹ میں ٹھہرنے پر زور دیا۔ طارق کو سارے پروگرام کا پتہ تھا۔ اُس نے اپنے چچا سے اجازت کی درخواست کی اور ہم نے فیصل آباد کی طرف رخ کرلیا۔



فیصل آباد میں

جب ہم فیصل آباد کی نواحی بستیوں کے پاس سے گزرے تو دور فیصل آباد کی بتیاں جھلملا رہی تھیں۔گلیوں بازاروں کی بھیڑ سے گزرتے پتہ ہی نہیں چل رہا تھا کہ ہم فیصل آباد کے کس علاقے سے گزر رہے ہیں۔اونچی عمارتیں اور رنگ برنگی روشنیاں شہر کی بارونق تصویر پیش کر رہی تھیں۔

ہماری خواہش تھی کہ پاکستان سے ''چکن'' کے دو دو تین تین زنانہ سوٹ خرید کر لے جائیں۔ہم اس خواہش کا اظہار عنایت اللہ عاجز سے پہلے ہی کر چکے تھے۔سو ہم عنایت کے گھر جانے کی بجائے سیدھے''

خیال ہوا۔ساتھ کھانے پینے کا دور بھی چلا۔اس کے بعد جناب محمد عابد سے اجازت لے کر پیدل ہی لباس بازار کی طرف چل پڑے۔اُردو کے نامور شاعر اشرف یوسفی جواسی اثناء میں دفتر پہنچ گئے تھے ہمیں کمپنی دینے کے لیے ہمارے ساتھ ہو لیے۔

مختلف بازاروں میں سے گزرتے ہوئے ایک چوڑی سی سڑک کو پار کیا جس کے دونوں طرف منیاری اور کئی دوسری بڑی دُکانیں سجی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔یہ سڑک پار کر کے تھوڑا آگے گئے تو ہر طرف کپڑے سے سجی دُکانیں ہماری منتظر تھیں۔یہی لباس بازار تھا جیسے جیسے ہم آگے بڑھتے گئے اُس بازار میں سے اور بھی تنگ بازار نکلتے گئے۔اس بازار میں آ کر پتہ چلا کہ ہم نے اپنی کار پریس مارکیٹ میں ہی کیوں کھڑی کر دی تھی۔اس بازار میں گاڑی کا گزرنا ایک طرف پیدل چلنا مشکل تھا۔بازار میں بھیڑ دیکھ کر لگتا تھا کہ جیسے سارا فیصل آباد ہی کپڑے خریدنے آ پہنچا ہے۔ہم آہستہ آہستہ چلتے اِردگرد کی دُکانوں میں جھانکتے آخر ایک تنگ سے بازار کی ایک لمبی سی تنگ دُکان میں داخل ہوئے۔دُکان دار نے پہلے جناب خاور جیلانی سے ہاتھ ملایا (جو کہ اُردو اور پنجابی کے بہت خوبصورت شاعر ہیں) اور پھر ہمارا دُکان میں سواگت کیا۔ہم نے اپنے مطلوبہ کپڑے کے متعلق بتایا تو دُکان کے ملازم لڑکوں نے ہمارے سامنے کپڑوں کا ڈھیر لگا دیا۔ہم نے پانچ منٹ کے اندر اندر سوٹ پسند کر لیے۔تین سوٹ میں نے خریدے اور پانچ ندیم پر مارنے۔خریداری کا تمام عمل دس منٹ میں ختم ہو گیا۔اتنی جلدی خریداری مکمل کرنے پر عنایت اور اس کے دوست حیران بھی تھے اور خوش بھی۔اُن کے خیال میں کپڑا پسند کرنے میں آدھ گھنٹہ تو لگ ہی جاتا ہے۔ واپسی پر جناب اشرف یوسفی نے ہمیں دو سوٹ خرید کر تحفتاً دیے جو ہم نے اُن کے اصرار پر محبت کی نشانی کے طور پر قبول کر لیے۔اب ہم عنایت اللہ عاجز کے گھر کی جانب رواں دواں تھے۔

جناب عنایت اللہ عاجز فیصل آباد میں کیبل (ٹی۔وی نیٹ ورک) کے بہت بڑے بزنس کے مالک ہیں۔اُن کی رہائش حاجی آباد کی گلی نمبر 1 میں ہے۔ہم گھر پہنچے تو

رات کے ساڑھے نو بج چکے تھے۔ ہم تینوں کے لیے مہمان خانے میں ٹھہرنے کا بندوبست کیا گیا تھا۔ مہمان خانہ گھر کے ساتھ ہی منسلک تھا۔ ساتھ ہی باتھ روم تھا۔ اسی مہمان خانے میں شعروشاعری کی محفل جمانے کا پروگرام بنایا گیا تھا۔ قالین کے اوپر گاؤ تکیے لگائے گئے تھے۔ عنایت نے صرف سات آٹھ قریبی دوستوں کو ہی بلایا تھا۔ اُس نے سب کو نو بجے کا کہہ رکھا تھا مگر راستے میں دیر ہو جانے کی وجہ سے فون پر دس بجے کا وقت دے دیا۔

پانچ چھ شاعر دوست تو ہمیں مثال پبلشرز کے دفتر میں ہی مل گئے تھے جنہیں زبانی دعوت دے دی گئی تھی۔ ایک اُردو شاعر دوست تک پیغام نہیں پہنچ سکا تھا۔ وہ مہمان خانے میں ہمارے منتظر تھے وہ ہمیں مل کر محفل میں شریک ہوئے بغیر ہی روانہ ہو گئے۔ اُردو شاعر جناب محمود ثناء نے مثال پبلشرز سے ہی فون کر کے نہ آ سکنے پر معذرت کر لی تھی۔ باقی جو دوست اس محفل میں شریک ہوئے اُن میں ہم چاروں (جرنیل سنگھ سیکھا، ندیم پرمار، طارق گوجر اور عنایت اللہ عاجز) کے علاوہ اُردو اور پنجابی کے خوبصورت شاعر جناب خاور جیلانی، اُردو افسانہ نگار جناب گلزار ملک، اُردو کے نامور شاعر جناب اشرف یوسفی، مثال پبلشرز کے مالک جناب محمد عابد اور ایک شاعر دوست جن کا میں نام بھول چکا ہوں، شامل تھے۔ ان دوستوں کے علاوہ عنایت اللہ عاجز کے والد صاحب بھی کچھ دیر کے لیے محفل میں حاضر ہوئے۔ اُن کی عمر اس وقت ۱۰۳ سال کے لگ بھگ ہے۔

دو تین شاعر دوستوں کے علاوہ باقی سب شاعر دوستوں سے ملاقات مثال پبلشرز کے ہاں ہی ہو گئی تھی۔ پھر بھی سب کا رسمی تعارف کروایا گیا۔ اس کے بعد شاعری کا دور شروع ہوا۔ زیادہ تر نے غزلیں ہی سنائیں وہ بھی اُردو میں۔ غزلوں میں رومانس کا عنصر زیادہ تھا۔ البتہ طارق گوجر کی غزل سماجی مسائل کو سامنے لاتی تھی اور اُس نے سنائی بھی پنجابی غزل، اگر کچھ لکھاری پنجابی میں لکھتے بھی تھے تو ساتھ اُردو میں بھی لکھتے تھے پھر بھی پنجابی زبان کے بہت سے شیدائی موجود ہیں جن کی وجہ سے پاکستان میں پنجابی زبان اور پنجابی ادب ترقی کر رہا ہے۔ پنجابی زبان کی ترقی کی بات سے ہی گفتگو کا دور شروع ہوا۔

ہم سے سوال کیا گیا کہ ''کیا کینیڈا میں دونوں پنجابوں کے لوگ آپسی گفتگو پنجابی میں کرتے ہیں؟''

''کیا دونوں پنجابوں کے پنجابیوں کا کینیڈا میں آپسی میل جول ہے یا وہ دور دور ہی رہتے ہیں؟''

اُن کے پہلے سوال کا جواب تو ہمارے پاس نہ میں ہی تھا مگر ہم نے سیدھے طور ہی نہ میں جواب نہ دیا۔ ہم نے بتایا کہ پہلی نسل کے لوگ تو آپس میں پنجابی ہی بولتے ہیں مگر نئی جنریشن پنجابی سے دور ہوتی جا رہی ہے۔

دوسرے سوال کے جواب میں کئی مثالیں دے کر ہم نے بتایا کہ وہاں دونوں پنجابوں کے لوگ آپس میں بھائیوں کی طرح ملتے جلتے ہیں۔ میں نے اپنے گھر کی ہی مثال دی کہ ہمارے گھر میں لاہور کا ایک خاندان رہتا ہے۔

بیرونی دنیا میں موجود پنجابیوں کے آپسی میل نے دونوں دیسوں (انڈیا، پاکستان) کو قریب لانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

اسی طرح پردیس میں پنجابی ادب کی بات چلی تو ہم نے بتایا کہ بدیسی ممالک میں بھی لکھاریوں کی تنظیمیں بنی ہوئی ہیں جن میں پاکستانی پنجاب کے لکھاری بھی ممبر ہیں۔ باتوں سے بات نکلتی ہوئی دونوں دیسوں کی سیاست کی طرف آ نکلی۔ سیاست سے بات دونوں طرف کی غریبی اور پھر غریبی کی وجوہات تک آ پہنچی۔ اس کھلی گفتگو میں بات کسی ایک موضوع پر نہیں ٹھہرتی تھی۔

ندیم کے نام کے ساتھ ''پرمار'' گوت (Subcast) لکھی جاتی ہے پرمار گوت سے بات چلی تو گوت سسٹم کے گرد گھومنے لگی۔ گوتوں میں اونچ نیچ کا مسئلہ بھی سامنے آیا۔ ایک اپنی گوت بتا کر اُس کی روٹس راجپوتوں سے ملانے لگتا تھا۔ گوتوں کے معاملے میں مَیں چپ بیٹھا تھا باوجودیکہ ہمارا گوت بھی ''سرا'' ہے اور میں سرا سے سراؤ بنا کر راجپوتوں میں شامل ہونے کا اعزاز پا سکتا تھا مگر میں نے اس گفتگو میں حصہ ہی نہیں لیا۔ آخر ایک شاعر دوست

نے پوچھ ہی لیا ''آپ نے گوت کے متعلق کوئی بات ہی نہیں کی۔آپ کی گوت کون سی ہے؟''

''میری گوت انسانیت ہے اور اس کی جڑیں بابا آدم علیہ السلام سے ملتی ہیں۔''

میری اس بات کے بعد گوتوں کی باتیں ہی ختم ہو گئیں۔

تھوڑی دیر بعد کچھ شاعر دوست دوبارہ ملنے کا وعدہ کر کے رُخصت ہو گئے باقی دوست کھانے کے انتظار میں تھے اور باتوں کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے تھے۔عنایت نے کھانا میز پر لگانے کا پیغام بھیج دیا تھا۔ بات اب لطیفوں پر آ گئی۔لطیفوں کی بھانت بھانت کی قسمیں گنوائی جانے لگیں۔ بات جب مذہبی لطیفوں پر پہنچی تو ایک ساتھی کہنے لگا ''جب کسی محفل میں ایک ہی مذہب کے لوگ جمع ہوں تو اکثر دوسرے مذاہب کو کمتر ثابت کرنے والے لطیفے چل نکلتے ہیں اور ان سے لطف لیا جاتا ہے ہماری محفلوں میں اکثر سکھوں کے لطیفے گردش کرتے رہتے ہیں۔آپ کی طرف بھی سکھوں نے مسلمانوں کے لطیفے ایجاد کیے ہوں گے۔''

ندیم پرمار نے بات ٹالنے کے لیے کہہ دیا ''ہم نے اس طرح کے لطیفے کبھی نہیں سنے۔''

''لطیفے تو ضرور بنائے ہوں گے مگر لگتا ہے آپ بتانا نہیں چاہتے۔'' اُس نے سکھوں کے دو گھٹیا سے لطیفے سنا کر کہا اس طرح کے۔'' مجھے یہ لطیفہ بازی کی بات اچھی نہ لگی، مجھے محسوس ہوا کہ وہاں بیٹھے کسی بھی شخص کو یہ بات اچھی نہیں لگی۔اس رویے کے پیچھے دوسرے مذہب کے لیے نفرت کے جذبات محسوس ہوتے تھے لیکن اب اگر اُس نے یہ سوال پوچھ ہی لیا تھا تو جواب دینا بھی ضروری تھا۔ چنانچہ میں نے کہا ''یہ جو آپ نے دونوں جوک (Joke) سنائے ہیں بس ان کے کرداروں کے نام بدل لیں۔ یہ دوسرے مذہب کے جوک (Joke) بن جائیں گے لیکن اگر کبھی کسی محفل میں کسی کے نام، ذات یا مذہب کے خلاف کوئی بات ہونے لگے تو میں وہ محفل ہی چھوڑ کر چلا جایا کرتا ہوں۔

میری گفتگو نے محفل کو گھمبیر سا بنا دیا۔شاید انہیں میری طرف سے ایسی گفتگو کی

اُمید نہ تھی۔شاید وہ آدمی لطیفوں کے ذریعے اسلام کے متعلق ہمارے خیالات جاننا چاہتا ہو لیکن اُس کے بعد کسی نے بھی اس موضوع پر بات نہ کی۔ ویسے بھی ڈائننگ روم میں کھانا لگ چکا تھا۔ہم کھانے کی میز پر آ گئے۔ برتنوں پر سے ڈھکن اُتارے گئے تو کھانے کی بھینی بھینی خوشبو سارے کمرے میں پھیل گئی۔کھانا یہاں بھی بہت پُرتکلف بنایا گیا تھا۔ بہت مزے سے پیٹ بھر کر کھانا کھایا، کھانے کے بعد باقی شاعر دوست رُخصت ہو گئے اور ہم مہمان خانے میں آ کر بستروں پر لیٹ گئے۔ لیٹتے ہی نیند نے آ گھیرا، جب آنکھ کھلی تو صبح کے چھ بج چکے تھے۔

ہم نہا دھو کر تیار ہو کر بیٹھ گئے۔ابھی تک گھر والوں کے اُٹھنے کے کوئی آثار نہ تھے۔دوسروں کے جاگنے سے قبل ہی عنایت اللہ عاجز کے والد صاحب چودھری محمد رمضان چھڑی کے سہارے آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ہمارے پاس آ گئے۔ وہ رات ساڑھے دس بجے کے قریب ہماری محفل سے اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے تھے۔جیسا کہ پہلے بھی ذکر ہوا ہے اس وقت اُن کی عمر ۱۰۳ سال ہے مگر دیکھنے میں وہ ۹۰ سال کے قریب لگتے ہیں۔ انہوں نے رات بھی ہم سے بہت اپنائیت کا اظہار کیا تھا مگر اُس وقت شاعر دوستوں کے وہاں آ جانے کی وجہ سے وہ ہمارے ساتھ زیادہ بات چیت نہیں کر سکے تھے۔عنایت کی زبانی ہمیں پتہ چل چکا تھا کی وہ مشرقی پنجاب سے اُجڑ کر یہاں آئے تھے۔مگر عنایت کی پیدائش چونکہ سن ۴۷ کے بعد کی تھی اس لیے اُس نے ہمارے ساتھ تقسیم سے پہلے کی کوئی بات نہیں کی تھی۔ جب چودھری رمضان کو پتہ چلا کہ انڈیا سے آئے ہوئے دو مہمان اُن کے گھر میں ٹھہریں گے تو انہیں بہت خوشی ہوئی اور انہوں نے اپنے بیٹے کو تاکید کر کے کہا تھا
''جب انڈیا والے مہمان گھر پہنچ جائیں تو مجھے بتا دینا میں اُن سے ملنا چاہتا ہوں۔''

چودھری رمضان دِن چڑھتے ہی کھانا کھا کر اپنے کمرے میں چلے جاتے ہیں اور وہیں اپنی نمازیں اور دوسری عبادت کرتے ہیں۔ پہلے وہ پانچوں وقت کی نماز کے لیے مسجد جایا کرتے تھے لیکن اب عمر زیادہ ہونے کی وجہ سے صحت اجازت نہیں دیتی کہ وہ مسجد جا کر

نماز ادا کریں۔ وہ مذہبی انسان ہیں لیکن مذہبی شدت پسند بالکل نہیں۔ وہ رات بھی ہمیں ملنے آ گئے تھے مگر تھوڑی سی گفتگو سے اُن کا من ہلکا نہیں ہوا۔ اسی لیے وہ صبح سویرے ہی ہمارے ساتھ باتیں کرنے کے لیے آ گئے تھے۔ رات اُن سے صرف اتنی باتیں ہوئی تھیں۔

''آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں اور پنجاب میں کون سا علاقہ ہے؟''

''باپو جی ہماری رہائش تو کینیڈا میں ہے لیکن میرا پچھلا علاقہ پھگواڑہ ہے اور ان کا موگا۔'' ندیم پرمار نے جواب دیا۔

موگے کا نام سنتے ہی اُن کی آنکھوں میں انوکھی سی چمک آ گئی۔ میرے ہاتھ کو کتنی ہی دیر تک پکڑے بیٹھے رہے۔ پھر آہستہ سے بولے۔

''اب تو موگا بہت بڑا شہر بن گیا ہوگا۔''

''ہاں جی! موگا ایک طرف گھل کلاں تک اور دوسری طرف بُگھی پورے تک پھیل چکا ہے۔ اب تو موگے کی آبادی ڈیڑھ لاکھ سے اوپر ہوگئی ہے۔ میں نے اپنے اندازے سے بتایا۔

''جب ہم موگا جایا کرتے تھے اُس وقت موگا ریل کے سٹیشن تک ہی ہوتا تھا۔ ہماری رشتہ داری ''شیخاں دی اگواڑ'' اور ''حاکم دی اگواڑ'' کی طرف تھی۔ پٹیالے سے گاڑی پر بیٹھ کر جایا کرتے تھے۔ انہوں نے پرانے وقتوں کو یاد کرتے ہوئے بتایا۔''

رات اُن کے ساتھ اتنی ہی باتیں ہوئی تھیں۔ اب انہوں نے اپنے متعلق بتایا کہ وہ سن ۴۷ء سے قبل پٹیالے کے نواحی گاؤں مرزاپور میں رہتے تھے۔ گاؤں کے وہ نمبردار تھے۔ پاکستان بنا تو انہیں اپنا گھر بار چھوڑ کر اِدھر آنا پڑا۔ اُس وقت اُن کی عمر پینتالیس سال تھی۔ یہاں آ کر انہیں ضلع گوجرانوالہ کے گاؤں ہمبو کی میں زمین الاٹ ہوئی۔ عام طور پر مہاجر ہو کر آنے والے لوگوں نے اپنی پرانی زمینوں کی نسبت یہاں زیادہ زمینیں الاٹ کروالی تھیں مگر انہیں اپنی پہلی زمین سے بھی کم زمین ملی اور نمبرداری بھی بحال نہ ہوئی۔ ۱۹۵۱ء میں کہیں جا کہ نمبرداری ملی۔ نمبرداری ملی تو سرکار کی طرف سے ساڑھے بارہ

ایکڑ زمین بھی مل گئی تھی۔مگر آج تک الاٹ نہ ہوسکی۔فائل آج بھی دفتروں میں چکر لگا رہی ہے۔

جب ہم نے پوچھا کہ ابھی تک زمین کیوں الاٹ نہ کروا سکے تو وہ کہنے لگے ''پہلے تو زیادہ خیال ہی نہ کیا۔ جب پیروی کی تو اکٹھی ساڑھے بارہ ایکڑ کہیں ملی ہی نہیں۔ باقی سرکاری محکموں کا سب کو پتہ ہی ہے۔لڑکے بھی دھیان نہیں دیتے۔''

زمین کی بات چھوڑ کر میں اُن سے پوچھ بیٹھا ''تقسیم کے وقت اس طرف امن امان سے ہی پہنچ گئے تھے یا جان مال کا نقصان اُٹھانا پڑا۔''

''سردار صاحب! اب یہ باتیں کرنے والی نہیں۔اُس وقت انسان وحشی ہوگیا تھا۔سیاستدانوں نے لوگوں کے جذبات بھڑکا کر انہیں وحشی بنا دیا تھا۔جب انسان وحشی بن جائے تو اپنا پرایا نہیں دیکھتا'' اتنا کہہ کہ وہ چپ کر گئے۔ مجھے پچھتاوا لگا کہ میں نے غلط وقت پر غلط بات کر دی تھی۔ کچھ دیر چپ رہنے کے بعد بولے ''ہمارے گاؤں کے باشندے بہت اچھے تھے۔ ہماری انہوں نے بہت مدد کی۔ میں تو اب بھی اپنے گاؤں کو دیکھنے کے لیے ترس رہا ہوں۔ میری بڑی خواہش ہے کہ جیتے جی ایک بار اُس مٹی کو سجدہ کر آؤں۔مگر حالات ہی کچھ ایسے رہے کہ میں جا نہ سکا۔آپ ہی کوئی سبیل کریں کہ میں اپنی جمن دھرتی دیکھ سکوں۔''

''اب دونوں دیسوں کی سرکاروں کے تعلقات بہتر ہو رہے ہیں۔پینسٹھ سال کی عمر والوں کو ویزے کی رعایت دینے کی بات بھی چل رہی ہے۔آپ کا ویزہ جلد لگ جائے گا۔'' ندیم پرمار نے اُن کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہا۔

''میرا بڑا لڑکا موگا میں ہی رہتا ہے۔آپ عنایت کو ساتھ لے کر موگا جائیں۔وہ آپ کے گاؤں اور جہاں آپ کہیں گے لے جائے گا۔'' میں نے عنایت سے بھی کہا کہ وہ کوشش کرے اور ویزہ لگوا کر بزرگوں کی خواہش ضروری پوری کرے۔

(لیکن افسوس کہ اُن کی یہ خواہش پوری نہ سکی اور وہ 16/جون 2008ء کو اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے)

ننکانہ صاحب کی دھرتی پر

عنایت اور طارق کی خواہش تھی کہ آج کا دِن فیصل آباد کی قابل دید جگہوں کی سیر کی جائے۔شام کو وہ ہمیں ننکانہ صاحب چھوڑ آئیں گےلیکن ہم نے پہلے ہی ۲۲/اپریل کو حسن ابدال جانے کا پروگرام بنایا ہوا تھا۔ یہ پروگرام قدسی صاحب کے ساتھ طے تھا۔ ۲۳/اپریل کوموگا پہنچنا تھا۔سوننکانہ صاحب جانے کے لیے ہمارے پاس صرف آج کا دِن تھا۔اس لیےاُن کا شکریہ ادا کرتے ہوئے آج ہی ننکانہ صاحب جانے کی درخواست کی۔ ہماری درخواست قبول ہوئی اور دوست محمد نے کار گیراج سے باہر نکال کر ننکانے کی راہ پر ڈال دی۔

ابھی ہم نے شہر کے ایک گیس سٹیشن پر گیس ڈلوانے کے لیے کار روکی ہی تھی کہ عنایت کےفون کی گھنٹی بج اُٹھی۔ گھر سے پیغام آیا تھا کہ ہم رسیانہ سے جوشہتوتیاں کینیڈا لے جانے کے لیے لائے تھے۔ وہ گھر کے فریج میں ہی بھول آئے ہیں۔عنایت نے فون پر بات روک کر ندیم پرمار سے پوچھا کیا خیال ہے کار واپس موڑ لی جائے۔

ندیم پرمار کی خواہش تو تھی کہ یہ شہتوتیاں کینیڈا لے جا کر اپنے گھر واں کو دکھائی

جائیں مگر ایک تو ہم گھر سے پانچ چھ میل دور نکل آئے تھے۔ دوسرے ہمیں پہلے ہی دیر ہو چکی تھی۔ ننکانہ صاحب کے گردواروں کے درشن کرنے کے بعد شام تک لاہور پہنچنا ضروری تھا۔ ایک اور بات بھی تھی۔ ندیم کو اپنے ٹھکانے پر پہنچنے میں ابھی چار پانچ دِن لگ جانے تھے۔ اس وقت تک شہتوتیاں گل سڑ کر خراب ہو جاتیں۔ چنانچہ یہ سب باتیں سوچ کر ندیم پر مارنے کہہ دیا ''واپس نہ مڑیں، شہتوتیاں بچے کھالیں گے۔ شہتوتیوں کا سواد تو رسیانے کے باغوں میں ہی چکھ لیا تھا۔ زیادہ کھائیں بھی ویسی اور کم کھائیں بھی۔'' ویسے اپنے باغ کی نشانی کو پیچھے چھوڑ آنے کا ندیم کو افسوس ہی رہا۔

گیس بھروانے کے بعد دوست محمد نے کار کو لاہور جانے کے لیے موٹروے نمبر ۳ پر ڈال دیا۔ موٹروے پر موٹریں اور کاریں کم کم ہی تھیں۔ طارق نے ہمیں بتایا کہ ٹول ٹیکس زیادہ ہونے کی وجہ سے گاڑیوں والے متبادل راستے بھی استعمال کرتے ہیں۔ جس کی وجہ سے ٹریفک کا رش کم ہوتا ہے۔

شیخوپورہ موٹروے سے کافی سائیڈ پر ہے۔ ہم نے شیخوپورہ والے انٹرچینج سے موٹروے چھوڑنا تھا لیکن یہ راستہ مرمت کے لیے بند ہونے کی وجہ سے اگلے راستے سے دوبارہ واپس آنا پڑا۔ اس طرح ہمیں کوئی بیس میل کے قریب آگے جانا پڑا اور ٹول ٹیکس الگ سے دوبارہ دینا پڑا۔ کار کی گیس بھی زیادہ لگی اور وقت بھی زیادہ خرچ ہوا۔ موٹروے پر تقریباً ہر ایک Exit کے قریب ریسٹ ایریا بنا ہوا تھا۔ جہاں سب ضرورتیں میسر تھیں۔ مجھے کینیڈا کے فری وے اور پاکستان کے موٹروے کے درمیان کوئی خاص فرق محسوس نہ ہوا۔ بلکہ اس موٹروے کی سڑکیں کینیڈا سے بھی بہتر تھیں۔

ریسٹ ایریا میں کچھ وقت ٹھہر کر ہم شیخوپورہ کو روانہ ہوئے۔ شیخوپورہ اگرچہ پرانا ضلعی ہیڈکوارٹر ہے مگر صفائی کے اعتبار سے اچھا شہر نہیں لگا۔ مشرقی پنجاب کے شہروں کی طرح ہی بھیڑ بھاڑ اور گندگی کے ڈھیروں سے لدا ہوا شہر، ہوسکتا ہے شہر کے کسی حصے میں باہر کی طرف خوبصورت کالونیاں بھی بنی ہوں جیسا کہ عام شہروں میں جدید طرز کی کالونیوں کا

رجحان بڑھ رہا ہے مگر شہر کا جو حصہ ہم نے دیکھا وہ ’’سوہنے شہر‘‘ کی جھلک نہیں دکھا رہا تھا۔

شہر سے آگے سڑک بہت چوڑی بنائی جا رہی تھی۔ سڑک زیرِ تعمیر ہونے کی وجہ سے کار کی رفتار بہت آہستہ کرنا پڑی۔ ہم نے پاکستان میں کئی جگہ نئی بن رہی سڑکوں اور چوڑی کی جا رہی سڑکوں پر کام ہوتا ہوا دیکھا یوں لگتا تھا جیسے آج کل پاکستان تیز رفتاری سے ترقی کی راہ پر گامزن ہو۔

ایک چھوٹے سے قصبے سے کار کو بائیں طرف موڑ کر ننکانہ صاحب کے راستے پر ڈال دیا گیا۔ ساڑھے بارہ بجے کے قریب ہم ننکانہ صاحب پہنچ گئے۔ آج گرمی بہت بڑھ گئی تھی۔ کار میں اے۔سی ہونے کی وجہ سے گرمی نہ لگی لیکن جب باہر نکلے تو سورج کی تپش نے چہرہ جھلسانا شروع کر دیا۔ ہم ہمت کر کے چل پڑے۔

ننکانہ صاحب چھوٹا سا شہر ہے۔ اس شہر کو دیکھ کر یہ احساس ہی نہیں ہوتا کہ اس شہر کی مذہبی اور تاریخی اعتبار سے کوئی اہمیت ہے، مین بازار میں سے گزر کر گردوارہ جنم استھان جانا پڑتا ہے لیکن گردوارہ صاحب کو جانے والی سڑک کا حال کوئی زیادہ اچھا نہیں۔ جگہ جگہ سڑک اُکھڑی ہوئی ہے سڑک کے اطراف کی دُکانیں سجاوٹ کے اعتبار سے کوئی خاص معیاری نہیں ہیں۔ بازار میں اَکا دُکا آدمی نظر آئے۔ دُکانوں میں خریدار نہ ہونے کے برابر تھے۔

ہاں گردوارہ صاحب کی شان نرالی ہے۔ بڑا ڈیوڑھی گیٹ بنا کر اِردگرد اونچی چاردیواری تعمیر کی گئی تھی۔ گیٹ پر ہمیشہ ایک پہریدار حاضر رہتا ہے۔ جب ہم اس گیٹ کے ذریعے اندر داخل ہوئے تو ایک مسلمان پہریدار نے گیٹ کھولا جو محکمہ اوقاف کا تنخواہ دار ملازم تھا۔ گیٹ سے اندر جاتے ہی من شانت ہو گیا۔ سامنے پھلواڑی میں قسم قسم کے پھول مہک رہے تھے۔ اس وسیع عریض صحن کے لمبے چوڑے باغیچے میں کسی فن کار مالی نے پھولوں اور سرسبز پودوں کو اس ترتیب سے لگایا ہوا ہے کہ آنکھیں اُس نظارے سے کبھی سیر نہیں ہوتیں۔ تین چار پودوں کو سبز کپڑے کی ترپال بنا کر سورج کی شعاعوں سے بچانے

کے لیے یوں ڈھکا گیا ہے جیسے کوئی تھکا ہوا مسافر سبز اوڑھنی لے کر آرام کر رہا ہو۔ پھول پودوں کا یہ باغیچہ دھرتی سے دو تین فٹ اونچا کر کے بنایا گیا ہے۔ دائیں طرف لنگر ہال کی بلڈنگ بنی ہوئی ہے اور بائیں طرف سرووراور سرائے ہے۔

گردوارہ جنم استھان سری گورونانک دیو جی کی ساری عمارت کسی ماہر آرکیٹیکچر کی ڈیزائن کی ہوئی لگتی ہے۔ باغیچے والے اس بڑے صحن سے آگے پھر ایک ڈیوڑھی ہے۔ اُس کے ساتھ کمرے بنے ہوئے ہیں۔

ہم پھلواڑی کے ساتھ ساتھ خوشبوؤں کا لطف لیتے ہوئے درشنی ڈیوڑھی کی جانب چل پڑے۔ یہاں ہمیں کوئی بھی سیوادار یا عقیدت مند نظر نہیں آیا۔ ہمیں گیٹ کیپر نے ہی بتایا کہ گردوارہ تو اُس گیٹ کے اندر ہے۔ ہم ڈیوڑھی کے پاس پہنچے تو ایک سکھ سیوادار جس کی عمر کوئی پچپاس کے لگ بھگ ہوگی ڈیوڑھی سے باہر آتا نظر آیا۔ ہم نے اسے فتح بلا کر اپنے بارے میں بتایا اور یہاں کی مریادا کے متعلق پوچھا۔ وہ جیسے جلدی میں تھا کہنے لگا ''آپ اندر متھا ٹیک کر باہر آجائیں۔ پھر آپ سے بات کرتے ہیں۔ آپ نے لنگر چھکنا ہے؟ (کھانا کھانا ہے) اُس نے ساتھ ہی لنگر چھکنے کے متعلق پوچھا تو مجھے یہ بات بڑی عجیب سی لگی کیونکہ گردواروں میں تو لنگر چلتا رہی رہتا ہے بلکہ پہلے لنگر چھکنے کے لیے ہی کہا جاتا ہے۔ پھر بھی میں نے کہا ''لنگر بھی چکھنا ہے اور چاہت کے لنگر کی بھی تمنا ہے۔''

''کتنی سنگت ہے؟'' اُس نے پھر پوچھا۔

''چار ساتھی ہم ہیں پانچواں ساتھی بازار کی طرف گیا ہے۔''

''بہت اچھا آپ متھا ٹیک کر آجائیں۔ میں لنگر والی سائیڈ پر آپ کا انتظار کرتا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ جلدی جلدی گیٹ سے باہر نکل گیا اور ہم ڈیوڑھی میں داخل ہو گئے۔ ڈیوڑھی کے دونوں طرف دو منزلہ کمرے بنے ہوئے ہیں۔ کونوں پر دو اونچے برج ہیں۔ ڈیوڑھی سے آگے کھلا صحن ہے۔ ڈیوڑھی کے بالکل سامنے بابا جی کا جنم استھان ہے۔ جنم استھان ایک چھوٹا سا کمرہ ہے جس میں بابا جی نے اوتار دھرا تھا۔ اُس کے گرد ڈاٹ

والے دروازے کی پرپکرما بنائی گئی ہے۔جنم استھان پر ہرمندر صاحب امرتسر کے گنبد کی طرح گنبد بنا کر سنہری چھتر اور کھنڈا بنایا ہوا ہے۔ اِردگرد ہر طرف سنگ مرمر لگا ہوا ہے۔ دربار صاحب کے دروازے پر چھوٹی برجیوں کے درمیان کمان دار چھجا بنا کر اس پر تحریر کیا گیا ہے۔''ست گرنانک پرگٹیا،مٹی دھند، جگ چانن ہوا۔''

دربار صاحب کے اندر داخل ہوئے تو سری گروگرنتھ صاحب کے پرکاش ستھان کے لیے سفید سنگ مرمر کی پالکی بنا کر اوپر چانئی صاحب لگا کر سنہری چھتر جھلایا گیا تھا اور نیچے سری گروگرنتھ صاحب کا پرکاش تھا مگر وہاں قابیا میں کوئی گرنتھی موجود نہیں تھا۔اندر ایک طرف نوے سال کے لگ بھگ بزرگ دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھے تھے۔اُن کے ساتھ ہی ایک ساٹھ سالہ (تقریباً) سردار صاحب بیٹھے تھے۔گروگرنتھ صاحب کے سامنے کئی قسم کے شستر سجائے گئے تھے لیکن وہاں کوئی گولک نہیں رکھی ہوئی تھی۔

ہم متھا ٹیک کر بیٹھ گئے تو ایک مسلمان بزرگ بھی ہمارے قریب آ کر بیٹھ گئے۔ جب بڑی عمر کے بھائی صاحب نے پرشاد تقسیم کیا تو ہمارے ساتھ عنایت اور طارق نے بھی بڑی شردھا کے ساتھ دونوں ہاتھ جوڑ کر پرشاد قبول کیا۔انہوں نے دس دس روپے کے چڑھاوے کے ہمراہ گروگرنتھ صاحب کو متھا بھی ٹیکا لیکن اندر آئے بزرگ مسلمان نے نہ ہی گروگرنتھ صاحب کے آگے سیس نوایا اور نہ ہی بھائی صاحب سے پرشاد لیا۔اُس بزرگ کا آنا ایک بجھارت ہی تھا ہم کچھ دیر گروگرنتھ صاحب کی حضوری میں بیٹھے رہے۔پھر میں نے وہاں بیٹھے ہوئے سردار سے پوچھا''ہم گردوارہ صاحب کے لیے کچھ مایا بھینٹ کرنا چاہتے ہیں وہ مایا کہاں جمع کروائیں۔''

سردار صاحب بولے''میں تو یہاں بابا ہربنس سنگھ کارسیوا والے کے جتھے کے ساتھ آیا ہوں۔''گردوارہ سچا سودا'' کی کارسیوا رچل رہی ہے۔آپ وہاں مایا دان کر سکتے ہیں۔ جو سنگت بھی یہاں آتی ہے وہ بڑھ چڑھ کر کارسیوا میں حصہ ڈالتی ہے لیکن یہاں کے متعلق مجھے کچھ نہیں پتہ۔یہ بھائی ایشر سنگھ یہاں کے سیوادار ہیں۔آپ ان سے پوچھ سکتے ہیں۔''

ایشر سنگھ کا نام سنتے ہی فوراً پتہ چل گیا کہ پہلے وہی یہاں کے مکھ سیوا دار ہوتے تھے۔اب یہاں اُن کا لڑکا مکھ سیوا دار ہے۔ ویسے وہ بھی یہیں سیوا نبھائی جا رہے ہیں۔ان کا سب سے چھوٹا لڑکا سردار کلیان سنگھ کلیان ہمیں لاہور میں پنجابی کانفرنس کے دوران ملا تھا۔اسی نے ہمیں ان کے متعلق بتایا تھا۔میں اُس سردار صاحب کے پاس سے اُٹھ کر سردار ایشر سنگھ کے پاس جا بیٹھا۔اُن سے مایا والا سوال دھرایا تو انہوں نے کہا ''یہ نکر میں گولک موجود ہے۔آپ جتنی چاہیں مایا ڈال سکتے ہیں۔اوقاف والے ہی اسے کھولتے ہیں۔اگر رسید کی ضرورت ہو تو باہر اوقاف بورڈ میں رقم جمع کروا کر رسید لے سکتے ہیں۔''

گردوارہ ننکانہ صاحب کے لیے کچھ مایا میرے بھتیجے نے بھجوائی تھی اور کچھ مایا دان کرنے کے لیے میرے بیٹے نے کہا تھا۔ان کی دی ہوئی رقم میں نے بھارتی کرنسی میں ہی گولک میں ڈال دی۔کچھ مایا ندیم پرمار نے بھی دان کی اور ہم گروگرنتھ صاحب کی حضوری سے باہر آ گئے۔میں یہ بات سمجھنے میں ناکام رہا کہ گولک گروگرنتھ صاحب کے سامنے کیوں نہیں رکھی گئی وہاں سے تھوڑا ایک طرف کر کے نکر میں کیوں رکھی گئی ہے۔

ہم نے گروگرنتھ صاحب کی حضوری میں سے باہر دربار صاحب کی پریکرما کی۔ دربار صاحب کی پوتر عمارت کے بائیں جانب ون کا ایک بہت پرانا درخت کھڑا تھا۔اس طرف وہ شہیدی جنڈ کھڑا ہے جس کے ساتھ باندھ کر مہنت نرائن داس نے سکھوں کو جلا کر شہید کیا تھا۔جنڈ کے ساتھ ایک پلیٹ لگائی گئی جس پر اُس شہید معرکے کا احوال لکھا ہوا تھا۔

شہیدی جنڈ کے ساتھ ہی بہت وسیع دربار بنا ہوا ہے۔ جہاں ہزاروں سنگتیں بیٹھ کر کیرتن کا آنند لے سکتی ہیں۔ دربار ہال کے ایک طرف سری گورو گوبند صاحب کے پرکاش کرنے کے لیے پالکی بنائی گئی ہے۔ہمیں بتایا گیا کہ سری گروگوبند صاحب کے پرگٹ ستھان کی جگہ بہت تھوڑی ہونے کی وجہ سے جتنے بھی سماگم کیے جاتے ہیں وہ اسی دربار ہال میں کیے جاتے ہیں۔

دربار ہال کے دائیں طرف یاتریوں کے ٹھہرنے کے لیے کوٹھیاں بنائی گئی ہیں۔

ان کوٹھیوں میں ویسے تو دو دو افراد کے ٹھہرنے کی گنجائش ہے لیکن جب سنگت زیادہ ہو جاتی ہے تو آٹھ آٹھ دس دس یاتریوں کو ٹھہرنا پڑتا ہے۔

ہم گردوارہ صاحب کے اندر باہر جانب اور ہر کونے کے درشن کر رہے تھے دھوپ کی وجہ سے فرش تپا ہوا تھا۔ ہم نے تو عقیدت کے باعث ننگے پیر یاترا کرنا ہی تھی۔ ہمارے دونوں مسلمان دوست بھی ساتھ ساتھ پیدل چل رہے تھے۔ انہوں نے اپنے سر رومالوں سے ڈھکے ہوئے تھے۔ وہ ہماری طرح ہی سکھ مریادا کا خیال کر رہے تھے۔ عنایت مووی بنا رہا تھا اور طارق خاص مقامات کے فوٹو لے رہا تھا۔

جنم استھان کے اندر باہر کے درشن کر کے ہم درشنی ڈیوڑھی کے راستے باہر نکل کر باغیچے کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے لنگر ہال کی جانب آ گئے۔ لنگر ہال کی عمارت تو بہت سندر بنی ہوئی ہے مگر اس وقت عمارت کو تالے لگے ہوئے تھے۔ لنگر ہال کی ایک جانب ایک کوارٹر میں دو سیوادارنیاں ہمارے لیے لنگر تیار کر رہی تھیں۔ کدو کی سبزی تیار ہو چکی تھی۔ انہوں نے ہمارے لیے وہیں صف بچھا دی اور ہم اُس پر چوکڑی مار کر بیٹھ گئے۔ سیوادر بیبیوں نے ہمیں بڑے پیار سے لنگر چھکایا۔ سگریٹ پینے کی طلب کی وجہ سے دوست محمد گردوارے میں نہ آیا۔ وہ کار پارک کر کے بازار کی طرف نکل گیا تھا۔ گردوارے کا مکھ سیوادار جو ہمیں دربار صاحب کے اندر جاتے سمے ملا تھا لنگر چھکنے کے دوران ہمارے پاس آ گیا۔

وہ ہمیں بتانے لگا ''یہاں گردواروں کے درشن کے لیے کسی تہوار پر ہی سکھ سنگتیں آتی ہیں۔ ورنہ آپ کی طرح کبھی کبھار کوئی سکھ درشن کرنے کے لیے آ جاتا ہے۔ اُن سے پوچھ کر ہی لنگر تیار کیا جاتا ہے لیکن یہاں سداورت لنگر کی مریادا نہیں ہے۔'' بھائی صاحب کا اخلاق بہت اچھا تھا۔ انہوں نے ہمارے دونوں ساتھیوں کو بھی احترام سے بلایا۔ انہوں نے کہا ''آپ اب یہاں آئے ہیں تو تمام گردواروں کے درشن کر کے جانا۔ اگر رات یہاں وشرام کرنا ہے تو ہمیں ابھی بتا دیں۔ ہم بندوبست کر دیں گے۔''

ہم نے انہیں بتایا کہ ہم لاہور جا کر ٹھہریں گے۔ ہم نے چائے چھک کر بھائی

صاحب اور بیبیوں کا شکریہ ادا کیا اور گیٹ کی طرف آ گئے۔ باہر گیٹ پر کھڑا پہریدار فوراً ہمارے پاس آ گیا اور پاکستانی گردواروں کی سی ڈیز خریدنے پر زور دینے لگا اسے شاید اُمید تھی کہ ہم اُسے کوئی بخشش دیں گے۔ ہم نے سی ڈیز لینے سے انکار کیا تو اس نے فوراً بخشش مانگ لی۔ میں نے اُس سے کہا۔

''یار میں تو تجھے اوقاف بورڈ کا ممبر ہی سمجھتا رہا۔''

''ہماری بورڈ کا ممبر بننے کی جرأت کہاں جی۔ ہم تو بابا نانک جی کے سیوادار ہیں اور آپ جیسے سرداروں کی دی ہوئی بخشش پر ہی گزارا کرتے ہیں۔''

اُس کی عاجزی کو دیکھتے ہوئے ہم نے بھارتی سو روپے کی بخشش دے دی تو وہ خوش ہو گیا اور دوسرے گردواروں کے درشن کروانے کے لیے ہمارے ساتھ جانے پر تیار ہو گیا لیکن ہم نے معذرت کی اور کہا کہ کار کی پانچ سیٹیں ہیں اور ہم پہلے ہی پانچ آدمی ہیں۔
''آپ گردواروں کے درشن کے لیے آئے ہیں تو آپ کے سارے گردواروں کی تاریخ کے متعلق پتہ ہونا چاہیے میں آپ کو ہر ایک گردوارے کی تاریخ کے متعلق معلومات دوں گا۔ کار میں تو یہاں سات سات سواریاں لیے پھرتے ہیں۔'' اُس نے منت بھرے لہجے میں کہا۔

''مہربانی! ہمیں سارے گردواروں کی تاریخ کا علم ہے۔ یہ کہہ کر ہم نے کار کا دروازہ بند کیا اور کار گردوارے کے گیٹ سے باہر نکال لی۔

گردوارہ جنم استھان کے سب سے نزدیک گردوارہ تنبو صاحب تھا۔ ہم پہلے تنبو صاحب کے درشن کے لیے گئے۔ یہ گردوارہ بھی بہت وسیع ہے مگر اس میں گھاس پھوس اُگا ہوا ہے۔ صفائی کا بالکل کوئی بندوبست نہیں۔ گردوارے کی عمارت بہت خوبصورت ہے لیکن گردوارے میں گرنتھی کوئی نہ تھا۔ دربار صاحب کے بائیں جانب ون کے درختوں کا ایک جھنڈ سا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ گرونانک دیو جی جب سچا سودا کر کے آئے تو اسی ون کے نیچے آ کر ٹھہرے تھے۔ دربار صاحب میں متھا ٹیکنے کے بعد ہم نے اس ون کے نیچے کچھ تصویریں بنوائیں اور پھر گردوارے کی چار دیواری میں چل پھر کر دیکھا۔ ایک طرف شیڈ

سے بنے ہوئے تھے۔ یہاں لکڑوں کے ڈھیر پڑے تھے اور اِرد گرد پڑی راکھ دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ جب بھارت سے زیادہ تعداد میں سنگتیں آتی ہوں گی تو یہاں بھی لنگر کا بندوبست کیا جاتا ہوگا۔

ہمیں یہاں کوئی سکھ یا اوقاف کا ملازم نہ ملا جس سے کوئی بات معلوم کی جاسکتی۔ اس حالت زار کو دیکھ کر من بڑا دُکھی ہوا۔ اگرچہ ننکانہ صاحب کے گردواروں کی حالت بہت اچھی ہے لیکن سیواداروں کی کمی کی وجہ سے گردوارہ جنم استھان کے علاوہ باقی گردواروں کی دیکھ بھال بہت اچھی نہیں ہے۔ جس کی وجہ سے اُن کی ظاہری حالت متاثر کن نہیں۔ حالانکہ وساکھی کے موقع پر ۱۱راپریل سے لے کر ۱۹راپریل تک دیس بدیس سے آٹھ دس ہزار کے قریب سکھ یہاں آئے تھے۔ ننکانہ صاحب میں بھی وہ ۱۶راپریل تک رہے تھے۔ وہ لوگ بھی کارسیوا کے ذریعے گردواروں کی حالت کو بہتر بنا سکتے تھے لیکن ہمیں ایسے کوئی آثار نظر نہیں آئے جس سے ظاہر ہوتا ہو کہ گردواروں کے درشن کے لیے آنے والے سکھوں نے گردواروں کی حالت کو سدھارنے میں کوئی کردار ادا کیا ہو۔

گردواروں کی بہتر دیکھ بھال نہ ہونے کی ایک وجہ ہمیں یہ بھی نظر آئی کہ یہاں سکھوں کی آبادی بہت کم ہے۔ وہ صبح شام متھا ٹیکنے تو ضرور جاتے ہیں۔ گردوارہ جنم استھان میں صبح شام کیرتن بھی ہوتا ہے لیکن وہاں آباد سکھ بھی گردوارہ جنم استھان کے علاوہ باقی گردواروں کی طرف دھیان نہیں دیتے۔ سکھوں کی خدمت میں ایک عرضوئی ہے۔ ''ننکانہ صاحب اور دوسرے گردوارے جن سے پنتھ کو جدا کیا گیا ہے کی دیکھ بھال اور کھلے درشن دیدار کا احساس ہمیں ان گردواروں کے درشن کے دوران ہوا۔''

ہماری یہ سوچ تھی کہ اگر دونوں حکومتیں سال میں تین بڑے قافلے بھیجنے کی بجائے گردواروں کے درشن دیدار کے لیے چھوٹے چھوٹے جتھے سارا سال بھیجنے پر غور کریں تو گردواروں کی دیکھ بھال کا مسئلہ بھی حل ہوسکتا ہے۔ گردواروں کی رونق اور گہما گہمی بھی بنی رہے گی اور دونوں دیسوں کا بیوپار بھی بڑھے گا۔ اس سے دونوں دیسوں میں بھی اور ان کی

عوام میں بھی قربت بڑھے گی۔

ننکانہ صاحب کے گردواروں کے درشن کرتے کرتے ہی چار بج گئے۔اس لیے گردوارہ سچا سودا کے درشن کا دیدار نہ کر سکنے کا دکھ من میں لے کر لاہور کی طرف واپس ہو لیے۔اس مرتبہ شیخوپورہ کی طرف جانے کی بجائے ہم جڑنوالہ روڈ کی طرف سے لاہور آئے۔ہم شاہدرے عبدالکریم قدسی کے گھر پہنچے تو شام کے چھ بج چکے تھے۔



آخری قیام شاہدرہ میں

جناب عبدالکریم قدسی مسلمانوں کے احمدی فرقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ سنی اور شیعہ مسلمان اگرچہ انہیں مسلمان نہیں سمجھتے مگر وہ خود کو اسلام کے پکے پیروکار سمجھتے ہیں۔ احمدیہ جماعت میں عالمی شہرت یافتہ شخصیات نے جنم لیا۔ مثلاً پاکستان کے پہلے نوبل پرائز یافتہ سائنسدان احمدیہ جماعت سے تعلق رکھتے تھے۔ پاکستان کی سرحدوں کے تعین کرنے والے کمیشن میں شامل سرظفراللہ خاں بھی احمدی تھے۔ سرظفراللہ خاں کی ایک بڑی تصویر شیشے میں سجا کر قدسی صاحب نے اپنی بیٹھک میں سجائی ہوئی تھی۔ قدسی صاحب کی بیٹھک میں صوفے پر بیٹھتے وقت میری نظر سب سے پہلے دیواروں پر پڑی۔ بیٹھک کے مزاج سے ہی انسان کے ذوق کا پتہ چل جاتا ہے۔ قدسی صاحب کی بیٹھک بھی اُن کے ذوقِ نظر کا پتہ دے رہی تھی۔ بیٹھک میں ایک طرف شیشے کی الماریاں کتابوں سے بھری ہوئی تھیں۔ ایک الماری کے دو تین خانے گرمکھی رسم الخط میں چھپی کتابوں سے بھرے ہوئے تھے۔ قدسی صاحب اُردو پنجابی کے شاعر تھے۔ اس لیے زیادہ تر کتابیں شاعری کی ہی تھیں۔ دیس بدیس سے آنے والے لکھاریوں کی طرف سے قدسی صاحب کو پیش کی گئی کتابیں بھی الماریوں

میں موجود تھیں۔

الماریوں کے اوپر قدسی صاحب کو ملے گئے اعزازت ترتیب سے رکھے گئے تھے۔ دیوار پر مہان شخصیتوں سے قدسی صاحب کو ایوارڈ ملتے سمے کی تصویریں سجائی گئی تھیں۔

قدسی صاحب ندیم پرمار کے قلمی دوست ہیں۔ انہوں نے کانفرنس کے دوران ہی ندیم پرمار کو اپنے پاس ٹھہرنے کے لیے کہہ دیا تھا۔ قدسی صاحب ملنسار طبیعت والے ہیں اور لکھاریوں کے قدردان ہیں۔ ڈاکٹر جگتار تو جب آئے ہیں تو کئی کئی دِن اُن کے ہاں ٹھہرتے ہیں۔ ہمیں بھی اُن کے پاس رین بسیرا کر کے خوشی ہوئی۔

چائے پی کر عنایت اور طارق دوبارہ ملنے کا وعدہ کر کے فیصل آباد واپس چلے گئے۔ انہوں نے ہماری جتنی آؤ بھگت کی اُس کا احسان چکانا بہت مشکل ہے۔ انہوں نے اپنے پورے دو دِن ہمارے نام کیے۔ عنایت نے اپنا کام چھوڑ اور ہمارے لیے اپنی گاڑی وقف کی۔ ہمیں کہیں ایک روپیہ بھی نہ خرچنے دیا۔ ہماری یاترا کو ایک یادگار کے طور پر سنبھال کر رکھنے کی خاطر اپنے مووی کیمرے سے مووی بنا کر اُس کی کیسٹ ہمارے حوالے کر دی۔ اب جب وہ ہمیں یہاں چھوڑ کر واپس جا رہے تھے تو اُن سے بچھڑتے ہوئے ہمارا من بھر آیا۔ اُن کی طرف سے ملا پیار اور عزت ہمیشہ ہمارے ساتھ ساتھ رہیں گے۔

فیصل آباد والے دوستوں کو الوداع کہہ کر دوبارہ بٹھک میں بیٹھے ہی تھے کہ قدسی صاحب کا فون آ گیا۔ فون سن کر واپس آئے تو کچھ دیر ہمارے پاس بیٹھے رہے پھر کہنے لگے ''چلیں آپ کو لاہور کی سیر کروالائیں۔''

''اب تو دِن ڈوبنے والا ہے۔ تاریکی میں کہاں جائیں گے۔ صبح سویرے اُٹھ کر حسن ابدال جانا ہے۔'' میں نے آرام کرنے کی نیت سے کہا۔

''اگر کہیں اور جانے کا ارادہ نہیں تو گردوارے ہی ہو آتے ہیں۔'' قدسی صاحب نے دوبارہ کہا۔

''ٹھیک ہے یہاں بیٹھ کر بھی تو گپیں ہی لگانی ہیں۔ گردوارے کے درشن کر آتے ہیں۔'' ندیم نے رضامندی ظاہر کردی۔

''قدسی صاحب نے آٹو رکشا منگوالیا اور ہم گردوارہ ڈیرہ صاحب کی جانب چل پڑے۔ راستے میں قدسی صاحب کہنے لگے ''یعقوب تو آپ کے ساتھ حسن ابدال نہیں جاسکے گا کیونکہ اُس کا ماموں ایکسیڈنٹ میں جاں بحق ہوگیا ہے۔ اب وہ ڈیڈ باڈی لینے گئے ہیں۔ ہم نے ابھی گھر میں عورتوں کو نہیں بتایا کیونکہ وہ رونے لگ جاتیں۔ فوت ہونے والا میری بہو کا بھی سگا ماموں ہے۔ ہمارے یہاں وٹہ سٹہ چلتا ہے۔ قدسی صاحب نے لاہور میں گھومنے کا بھید کھولا۔

مجھے اُس وقت کلونت سنگھ ورک کی کہانی ''دھرتی ہیٹھلا بلد'' (دھرتی کے نیچے والا بیل) یاد آ گیا۔ قدسی صاحب نے اتنے بڑے صدمے کو تنہا اپنے کندھوں پر اُٹھا رکھا تھا تاکہ مہمانوں کی مہمان نوازی میں کوئی کسر نہ رہ جائے۔ وہ اپنے بیٹے کو بھی تاکید کرآئے تھے کہ رات کے کھانے کے بعد ہی عو

تک قدسی کو ایکسیڈنٹ کی وجہ کا علم نہ تھا۔ وہ تو فون پر ایکسیڈنٹ کی خبر سنتے ہی ہمیں باہر لے آیا تھا اور اپنے بیٹے کو گھر والوں سے فون دور رکھنے اور اُن کے سامنے فون نہ سننے کی تاکید کر آیا تھا۔ باتوں باتوں میں پتہ ہی نہ چلا اور ہم منیار پاکستان کے پاس سے گزر کر گردوارہ ڈیرہ صاحب پہنچ گئے۔

گردوارہ ڈیرہ صاحب میں خوب رونق تھی۔ یہاں وساکھی پر آئے ہوئے بدیسی یاتری ٹھہرے ہوئے تھے۔ لنگر ہال میں چار پانچ بیبیاں لنگر تیار کر رہی تھیں۔ چار پانچ سکھ باہر لان کی روش پر بیٹھے ہوئے تھے۔ دربار صاحب میں بھی ایک گرنتھی گرنتھ صاحب کا پاٹھ کر رہے تھے۔ جب ہم دربار صاحب کے اندر سے متھا ٹیک کر باہر آئے تو ہماری سردار کلیان سنگھ کلیان سے ملاقات ہوگئی۔ وہ بھی گردوارے متھا ٹیکنے آئے تھے اور متھا ٹیکنے کے بعد اپنے موٹر سائیکل کی طرف جا رہے تھے۔ ہمیں دیکھ کر وہ واپس ہو لیے۔ اُس نے ہمیں ننکانہ صاحب کی زیارتوں کے متعلق پوچھا کہ کیا ہم وہاں درشن کر آئے ہیں۔ ہم نے بتایا کہ درشن کر کے ابھی واپس آئے ہیں اور شاہدرے اپنا سامان رکھ کر سیدھے اس طرف آ گئے ہیں۔ ہم نے اس کے والد سردار ایشر سنگھ اور بڑے بھائی سے اپنی ملاقات کے متعلق بھی اسے بتایا۔ اُس نے ہمارے کل کے پروگرام کے متعلق پوچھا۔ ہم ابھی شش و پنج میں ہی تھے کہ کل پنجہ صاحب جائیں نہ جائیں۔ ہماری شش و پنج کو دیکھ کر اُس نے کہا کہ پھر پتہ نہیں کب موقع ملے آپ درشن کر ہی آئیں۔ آج یہاں سے دو یاتری سوا دس بجے والی ڈیلکس بس پر پنجہ صاحب جا رہے ہیں آپ اُن کے ساتھ ہی ہو آئیں۔ یہ بس پشاور جاتی ہے اور پنجہ صاحب کے نزدیک ہی اس کا سٹاپ ہے۔

کلیان کا مشورہ تو بہت اچھا تھا مگر ہم تو خالی جیب ہی نکلے تھے۔ جیبوں میں صرف چند سو روپے تھے۔ ہمارا سارا سامان تو شاہدرے قدسی کے گھر پڑا تھا۔ یہاں سے آدھا پونا گھنٹہ جانے کا سفر تھا اور اتنا ہی واپس آنے کا۔ لہٰذا ان یاتریوں کے ساتھ جانا تو مشکل تھا جہاں تک اکیلے رات کا سفر کرنے کی بات تھی اس سے ہم جھجکتے تھے۔

کلیان سنگھ نے چائے کا آرڈر دے دیا۔ اُس نے ٹیکسی پر جانے کا بھی مشورہ دیا۔ ہم نے کہا کہ وہ ٹیکسی کا پتہ کرلے۔ کلیان نے موبائل پر ہی ٹیکسی والوں سے رابطہ کرلیا۔ اُس نے بتایا کہ ٹیکسی والے چار ہزار روپے دیہاڑی اور گیس کا خرچہ مانگتے ہیں۔ ٹیکسی کے لیے پانچ چھ ہزار خرچنے کا حوصلہ نہ پڑا۔ چنانچہ ہم نے پنجہ صاحب کا خیال ہی دل سے نکال دیا۔ کلیان کا اب بھی یہی مشورہ تھا کہ پنجہ صاحب ضرور جانا چاہیے۔ ''صبح تک جانے کا مشورہ کرلیں گے۔'' یہ کہہ کر ہم مہاراجہ رنجیت سنگھ کی سمادھ والی بلڈنگ کی تصویریں لینے لگے۔ ایک دو تصویریں کلیان کے ساتھ بھی بنوائیں۔

چائے کی کیتلی لے کر ایک آدمی چائے دینے آیا۔ ہمیں یہ جان کر بڑی حیرت ہوئی کہ چائے لنگر سے باہر بن رہی تھی اور اس کے پیسے دینے پڑتے تھے لیکن ہمیں یہ علم نہ ہو سکا کہ کلیان نے چائے کے لیے ادائیگی کی یا نہیں۔ ہم چائے پی کر گردوارے سے باہر آ گئے اور کلیان سنگھ کلیان بھی اپنے موٹر سائیکل کی طرف چلا گیا۔

ہم نے مین سڑک پر آ کر آٹو رکشہ والوں سے شاہدرہ جانے کا پوچھا تو وہاں جانے کے لیے کوئی بھی تیار نہ تھا۔ اگر کوئی تیار بھی ہوتا تو ڈیرھ سو روپے سے کم نہ مانگتا۔ رات کے نو بج رہے تھے اپنے ٹھکانے پر پہنچنے کے لیے من بے چین ہو رہا تھا۔ میں تو ڈیڑھ سو روپے دینے کے لیے بھی تیار تھا مگر قدسی کا کہنا تھا کہ پچاس روپے کرایہ ہے۔ ڈیڑھ سو دینا کسی طرح بھی مناسب نہیں۔ کچھ دیر کے بعد ایک رکشہ والے نے سو روپے مانگے سودا اسّی روپے میں ہو گیا اور ہم رکشہ میں بیٹھ کر قدسی کے گھر آ گئے جب ہم نے اسے سو روپے کرائے کے لیے دیے تو اس نے بقایا نہ دیا۔ جب ہم نے بقایا کے بیس روپے مانگے تو وہ کہنے لگا ''آپ اسّی روپے کہہ کر بیٹھ گئے تھے۔ میں تو اسّی روپے میں رضامند نہیں تھا۔''

قدسی غصے میں آ گیا تو میں نے کہا ''پلیز قدسی صاحب رہنے دیں۔'' میرے دل میں بھی رکشہ والے کے رویے کے خلاف غصہ تھا لیکن میں نے بڑے تحمل سے کہا ''بات سنو بھائی میرے، ہم اور آپ اپنے اپنے دیسوں کے نمائندے ہیں۔ ہمارے برتاؤ سے

آپ نے اندازہ لگانا ہوتا ہے کہ اس دیس کے لوگ کیسے ہیں اور آپ کے رویے سے ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کے لوگ کس طرح کے چال چلن والے ہیں تم نے کرائے کے متعلق جھوٹ بول کر پورے لاہور کے رکشہ والوں کا امیج خراب کیا ہے۔ جا۔۔۔ یہ بیس روپے تجھے بخشش کے طور پر دیے۔''اتنی بات کہہ کر میں نے قدسی کا ہاتھ پکڑا اوراس کے دروازے کی طرف چل پڑا۔ آٹو رکشہ والا ہمیں جاتے ہوئے دیکھتا رہا لیکن بولا کچھ نہیں۔

گھر آ کر بیٹھک میں بیٹھے تو قدسی کے بیٹے نے بتایا کہ فیصل آباد سے فون آیا تھا۔ دس بجے کے قریب دوبارہ فون کریں گے۔ ہم نے سمجھا کہ عنایت اور طارق نے فیصل آباد پہنچ کر فون کیا ہوگا لیکن قریب پندرہ منٹ بعد جب دوبارہ فون آیا تو پتہ چلا کہ اشرف یوسفی کا فون ہے اور وہ میرے ساتھ بات کرنا چاہتا ہے۔ میں نے ریسیور کان سے لگایا تو وہ کہہ رہا تھا ''جرنیل جی! میں آپ کو ایک تکلیف دے رہا ہوں مہربانی کر کے میری سالی جی کے لیے دو سوٹ لے جائیں۔''

''بھائی صاحب ہمارے پاس پہلے ہی وزن زیادہ ہو چکا ہے۔ ہم اور سامان نہیں لے جاسکتے۔ آپ نے جو سوٹ ہمیں دیے تھے ہم وہی آپ کی طرف سے اُن کو دے دیں گے۔ میں نے اپنی طرف سے انکار کر دیا۔''نہ نہ میں آپ کے بھروسے پر سامان روانہ کر چکا ہوں۔ وہ پہلے والے سوٹ تو میں نے آپ کو تحفے کے طور پر دیے تھے۔ اب جو سوٹ بھیجے ہیں اُن میں آپ کے لیے ایک ایک سوٹ اور ہے۔ برائے مہربانی وہ پیکٹ ضرور لے جائیں۔''یوسفی نے اصرار کے ساتھ کہا۔

''ہم زیادہ سے زیادہ ایک سوٹ لے جاسکتے ہیں لیکن ہم تو کل صبح سات بجے ہی انڈیا چلے جائیں گے اُس وقت تک تو ایک سوٹ بھی نہیں پہنچ سکتا۔''میں نے ایک سوٹ کے سلسلے میں حائل مشکل بھی بتا دی۔

میں نے فون سن کر ندیم کو بتایا''یوسفی اپنی سالی کے لیے ہمارے ہاتھ دو سوٹ کینیڈا بھیجنا چاہتا ہے۔''

''میں نے تو کل ہی اندازہ لگا لیا تھا جب اُس نے اپنی سالی کا فون نمبر اور ایڈریس تمہیں لکھوایا تھا۔'' ندیم نے اپنے خیال کا اظہار کیا۔

''میں نے اسے ایک سوٹ کے لیے ہاں کر دی ہے۔ چلو ایک سوٹ کے لیے جگہ بنا ہی لیں گے۔ دو چار کتابیں کم کر لیں گے۔'' میں نے اپنے دل کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''میں نے بھی آپ کے ہاتھ تھوڑا سا سامان بھیجنا ہے۔ ٹورنٹو میں اپنے بھائی کے لیے۔'' قدسی نے کہا۔

''وینکوور سے ٹورنٹو تو بہت دور ہے۔ جیسے لاہور سے لندن۔'' میں نے اسے بتایا۔

''میں ٹورنٹو میں ایک دِن اپنی بیٹی کے پاس ٹھہروں گا۔ ان کا سامان میں لیتا جاؤں گا۔'' ندیم پر مار نے یہ کہہ کر قدسی کا مسئلہ حل کر دیا۔

اس کے بعد ایک مرتبہ پھر پنچھ صاحب جانے یا نہ جانے کے متعلق تبادلہ خیال ہوا کہ کل ہی واپس گھر چلے جائیں۔ کھانا تیار ہو چکا تھا۔ یہاں بھی کھانا بہت پُر تکلف تھا۔ ہمیں پاکستان میں چار پانچ گھروں میں کھانا کھانے کا موقع ملا۔ ہر گھر میں کئی قسم کا گوشت تیار کیا جاتا۔ کئی کئی دال سبزیاں تیار کی ہوئی ہوتیں۔ دو تین قسم کی تو روٹیاں ہی ہوتیں۔ قدسی کے ہاں نان اور تندوری روٹی کے علاوہ توے کی روٹی کا اتنا بڑا سائز تھا کہ ایک پوری روٹی کھانا بھی مشکل تھا۔ کھانا دیکھ کر میں نے کہا ''آپ کو آج کے دِن اتنا تکلف نہیں کرنا چاہیے تھا۔ میرا اشارہ اُن کے رشتہ دار کی وفات کی طرف تھا۔''

آپ نے کون سا ہمارے پاس روز روز آ کر رہنا ہے۔ زندگی میں غم اور خوشی تو آتے ہی رہتے ہیں۔'' قدسی نے کہا اور پھر اُن بدیسی پنجابی لکھاریوں کے متعلق بتانے لگا جو اس کے پاس آ چکے تھے۔ اُس نے بتایا ''ڈاکٹر جگتار جب بھی ادھر چکر لگاتے ہیں تو میرے پاس ضرور آ کر ٹھہرتے ہیں۔ انگلینڈ سے بھی کوئی نہ کوئی لکھاری آیا ہی رہتا ہے۔

اُن کی مہمان نوازی کا شرف بھی حاصل ہو جاتا ہے۔مشرقی پنجاب سے آنے والوں میں سے بھی کوئی نہ کوئی اس غریب خانے میں اپنے مبارک قدم رکھ ہی دیتا ہے۔

''آپ کے ساتھ ہم نے جو چند لمحات گزارے ہیں وہ ہمارے لیے اپنی زندگی کا قیمتی سرمایہ ہیں، میری دلی تمنا تھی آپ سے ملاقات کی۔ وہ پوری ہوگئی ہے۔'' ندیم پرمار نے بھی جذباتی ہوتے ہوئے کہا۔

کھانے کے بعد بھی یہی گفتگو چلتی رہی۔ جب نیند غالب آنے لگی تو قدسی صاحب ہمیں خدا حافظ کہہ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ہم بھی اپنے بستروں میں لیٹتے ہی نیندرانی کی گود میں جابیراجے۔

صبح چار بجے کے قریب مولوی صاحب کی اذان کے ساتھ آنکھ کھلی۔ کچھ دیر کے بعد پھر نیند نے قابو پالیا۔ ساڑھے چھ بجے کے قریب گلی میں سے کوئی ٹرک گزرا۔ مجھے جاگ آ گئی۔اب تو دِن چڑھ آیا تھا۔ میں نے بستر، چھوڑا اور غسل خانے میں چلا گیا۔ جب نہا کر باہر نکلا تو ندیم بھی جاگ چکا تھا۔ وہ بھی جلدی ہی نہا کر تیار ہوگیا۔ ہمیں جاگتے دیکھ کر قدسی صاحب بھی بیٹھک میں آ گئے اور مجھے کہنے لگے ''ایک آدمی صبح پانچ بجے آ کر آپ کے لیے کپڑوں کا پیکٹ دے گیا ہے۔''

اس بڑے سے پلاسٹک بیگ کو دیکھ کر میرے تو ہوش ہی ٹھکانے نہ رہے۔ یہ پیکٹ کوئی نو دس کلو وزنی ہوگا۔ پیکٹ کھولا تو اُس میں سے چھ وزنی وزنی زنانہ سوٹ نکلے۔ دِل میں سے غصے کا غبار سا اُٹھا مگر اس پر قابو پا کر یوسفی کا فون ملایا لیکن فون اٹھا کوئی نہیں رہا تھا۔ کچھ دیر بعد دوبارہ فون ملانے کی کوشش کی مگر پھر بھی نہ ملا۔ ناشتہ کرنے کے بعد بھی فون کے پاس آ بیٹھے اور نمبر ملاتے رہے لیکن یوسفی سے رابطہ قائم نہ ہوسکا۔ پھر عنایت کو بھی فون کیا مگر اُس کا موبائل بند تھا۔ اتنا وزن ہم کسی صورت بھی نہیں لے جاسکتے تھے۔ ندیم پرمار نے قدسی کا پہلا سامان اپنے پاس رکھ لیا تھا، اور سامان رکھنے سے وہ انکاری تھا۔ آخر قدسی صاحب ہماری مدد کو آئے اور کہا ''اگر آپ ایک آدھ سوٹ لے جاسکتے ہیں تو لے جائیں۔

میں باقی سارا سامان اسی طرح ہی یوسفی کو پہنچا دوں گا اور اسے سمجھا بھی دوں گا۔''

قدسی کی تجویز پر عمل کرتے ہوئے میں نے ایک اچھا سا گلابی سوٹ بیگ میں سے نکال لیا اور باقی بیگ قدسی کے حوالے کرتے ہوئے کہا''ایک یہ سوٹ اور ایک سوٹ جو اس نے ہمیں تحفے کے طور پر دیا ہے۔ یہ دونوں سوٹ ملا کر میں اُس کی سالی جی کو پہنچا دوں گا۔ اتنا وزن کینیڈا تک لے کر جانا ہمارے بس سے باہر ہے۔ آپ یوسفی صاحب کو بتا دیں اور یہ سامان ان تک پہنچا دیں۔

''اس بات کی آپ فکر نہ کریں۔ یہ میرے پاس یوسفی کی امانت ہے۔ یہ امانت اُس تک پہنچ جائے گی۔'' قدسی صاحب نے یقین دلایا۔ (کینیڈا آ کر میں نے یوسفی صاحب کی سالی جی کے گھر فون کر دیا تھا۔ ان کے ہم زلف ہمارے گھر آ کر سامان لے گئے تھے۔ انہیں یہ پتہ چل چکا تھا کہ باقی سوٹ ہم لاہور چھوڑ آئے ہیں)

اس کام سے فارغ ہوئے تو واپسی کی تیاری میں لگ گئے۔ قدسی نے اپنے دوست مختار احمد کو فون کر کے بلایا تھا۔ انہوں نے ہمیں واہگہ بارڈر تک پہنچانا تھا۔

وہ کار لے کر ہماری طرف آ رہے تھے۔ ندیم پرمار مجھے کہنے لگا''قدسی کے گھر پوتے نے جنم لیا ہے۔ ابھی دس بارہ دِن کا ہی ہے۔ ہمیں اس کے لیے شگن دینا چاہیے۔''

''یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔ کل اس کے متعلق بات ہی نہیں کی؟ شگن تو ضرور دینا چاہیے۔'' میں نے اُس کی تائید کی۔

''کل سوگ کی خبر آنے کی وجہ سے اس بارے میں بات کرنا مناسب نہ تھا۔ چلو قدسی کو شگن کے روپے پکڑا دیتے ہیں۔'' ندیم نے اپنا بٹوا نکالتے ہوئے کہا۔

بارڈر کی طرف روانہ ہوتے وقت جب ہم شگن کے روپے قدسی کو دینے لگے تو اس نے کہا''آپ اندر جا کر اپنے ہاتھوں سے بچے کو شگن دیں۔''

اُس کی یہ بات سن کر ہم کچھ حیران ہوئے کیونکہ اسلامی ثقافت میں پردے کی بہت پابندی ہے۔ یہاں عورتیں بیگانے مردوں کے سامنے نہیں آتیں۔ اب اگرچہ تعلیم عام

ہونے کی وجہ سے عورتیں بازار میں چلتے پھرتے نظر آتی ہیں۔فنکشنز اور جلسے جلوسوں میں بھی وہ شامل ہوتی ہیں مگر گھروں میں پردہ داری کا رواج عام ہے۔

''آپ کے معاشرے میں پردہ داری کا رواج ہے۔ یہ شگن آپ خود ہی دے آئیں۔''ہم نے شگن کی رقم اسے پکڑاتے ہوئے کہا۔

''یہاں آپ کے لیے کوئی پردہ نہیں۔ جیسے یہ میرے بچے ہیں ویسے ہی آپ کے بھی ہیں۔آئیں اور اندر جا کر بچوں کو آشیر واد دیں۔ وہ ہمارا ہاتھ پکڑ کر گھر کے اندر لے گیا۔ مین گیٹ سے اندر جا کر تقریباً سات فٹ کی دوری پر کپڑے کا پردہ لٹک رہا تھا۔لمبی ڈیوڑھی کے آگے صحن تھا اور آگے کئی کمرے تھے۔قدسی ہمیں ایک کمرے میں لے گیا۔ہم شرماتے ہوئے اندر گئے تو ایک چار پائی پر اُس کی بیٹی اور بیوی بیٹھی تھیں۔ دوسری چار پائی پر اُس کی بہو نومولود بچے کو ساتھ لیے لیٹی ہوئی تھی۔ہم نے بچے کے جنم کی مبارک باد دی۔ شگن کے روپے بچے کے پاس رکھے۔اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا اور واپس آ گئے۔ مجھے گھر میں جاتے ہوئے بڑی جھجک محسوس ہو رہی تھی۔ لگ رہا تھا جیسے کسی کے گھر کے پردے کو اُٹھا کر ہم سے کوئی گناہ ہو گیا ہو۔اس کے ساتھ ساتھ قدسی کے ترقی پسند خیالات کا بھی ہم پر گہرا اثر پڑا تھا۔ہم راستے میں بھی اس کی باتیں کرتے رہے۔

قدسی کا دوست مختار احمد اپنی کار لے کر پہنچ چکا تھا۔مختار ڈاکٹر جگتار کا بھی گہرا دوست ہے۔ وہ جگتار کا بہت بڑا پرستار ہے۔ جب بھی ڈاکٹر جگتار لاہور آتے ہیں تو مختار اپنے تمام کام دھندے چھوڑ کر اُن کے پاس آ جاتا ہے۔آج بھی قدسی کے کہنے پر فوراً اپنے سارے کام چھوڑ کر وہ ہمیں بارڈر پر چھوڑنے آ گیا تھا۔ہم پاکستان کی میٹھی یادوں کو دامن میں سمیٹے قدسی کی مہمان نوازی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے بارڈر کی طرف چل پڑے۔

آج ۲۲ /اپریل کو حضرت محمد ﷺ کا مبارک جنم دِن عید میلا د النبی ﷺ تھا۔صبح ہی سے شہر میں رونقیں ہو گئی تھیں۔ ہر طرف چہل پہل تھی لیکن ہمیں شالا مار باغ تک زیادہ بھیڑ کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔جیسے جیسے ہم بارڈر کی طرف جا رہے تھے جگہ جگہ شامیانے لگے ہوئے

نظر آ رہے تھے۔لوگ چھوٹے چھوٹے جلوسوں کی شکل میں اکٹھے ہو رہے تھے۔رنگ برنگے کپڑے پہنے بازاروں میں چل پھر رہے تھے۔کئی جگہ زردے کا بھنڈارہ چل رہا تھا۔ بچے اور بوڑھے سب نیاز کے ان چاولوں کو حاصل کرنے کے لیے ایک دوسرے سے آگے ہاتھ بڑھا رہے تھے۔

ایک جگہ بہت بڑا جلوس سڑک کے درمیان چل رہا تھا۔جلوس کے اِردگرد پولیس کی بھاری نفری بھی موجود تھی۔لوگ جوش و جذبے سے نعرے لگا رہے تھے۔ کچھ دیر کے لیے ہماری کار کو رُکنا پڑا۔میرے دِل میں ایسے ہی وسوسہ پیدا ہوا کہ کہیں کوئی من چلا ہمیں دیکھ کر شرارت ہی نہ کر دے اور ہمارے دِل میں ایک ہفتے میں مغربی پنجاب کی بنی تصویر ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو جائے لیکن ایسا کچھ نہ ہوا اور نہ ہی کسی طرف سے کوئی بُرا جملہ ہی سننے کو ملا۔ہم امن چین سے واہگہ بارڈر پہنچ گئے۔

کار سے اُترتے ہی قلی ہمارے اِردگرد اکٹھے ہو گئے۔ جو قلی آتے وقت ہمارا سامان اس طرف لائے تھے ہم نے انہیں ہی اپنا سامان دے دیا۔جب ہم کسٹم والوں کی طرف آئے تو سامنے فلم ڈائریکٹر سنیتا دھیر بیٹھی نظر آئیں۔اُس کے ساتھ پنجابی زبان کانفرنس کے موقع پر معمولی سی واقفیت ہو چکی تھی۔اُس کا حال چال پوچھا اور لاہور میں گزارے دو دِنوں کے متعلق اُس کے خیالات معلوم کیے۔اُس سے وہاں بیٹھنے کی وجہ پوچھی تو اُس نے بتایا کہ وہ ڈاکٹر جگبیر سنگھ کے بیٹے راج وندر سنگھ راجو کے انتظار میں ہے۔راجو کے آنے کا سن کر ندیم پر مارنے بھی قلیوں کو وہیں روک لیا اور مجھے کہنے لگا ”راجو کا کچھ دیر انتظار کر لیتے ہیں۔“

ایک آدمی ہمارے پاس آیا اور کرنسی کے تبادلے کے متعلق پوچھنے لگا اُس کا بتایا ریٹ اچھا تھا۔اس لیے ہم نے ساری پاکستانی کرنسی انڈین کرنسی میں بدلوالی۔اتنی دیر میں راجو بھی آ گیا اور ہم اپنا سامان اُٹھوائے پڑتالی افسر کے کمرے میں آ گئے۔قلیوں نے ہمارا سامان الگ الگ ترتیب کے ساتھ کاؤنٹر پر رکھ دیا۔سب سے آگے ہمارا سامان پڑا تھا۔

اس کے بعد سنیتا دھیر کا اور اس کے بعد راجو کا۔ سنیتا کے پاس دو اٹیچی کیس اور ایک بڑا گتے کا پیک شدہ ڈبہ تھا۔

پڑتالی افسر نے کمرے میں آتے ہی ہمارے سامان پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا ''سردار جی کیا لے کر آئے ہو۔''

''پاکستانی بھائیوں کا پیار۔'' ندیم پرمار نے مختصر سا جواب دیا۔ اُس نے ہمارے اٹیچیوں کو غور سے دیکھے بغیر ہی کہا ''اچھا، جاؤ۔'' اور خود سنیتا دھیر کے سامان کی طرف بڑھ گیا اور اس سے سامان کے متعلق پوچھ کر پڑتال کرنے لگا۔

ہم پاکستانی کسٹم افسروں سے اپنے پاسپورٹوں پر مہریں لگوا کر زیرو لائن تک آ گئے تھے مگر ہمیں سنیتا دھیر اور دوسرے دوستوں کے قلی پیچھے دور دور تک نظر نہ آئے۔

زیرو لائن سے ہمارا سامان انڈین قلیوں نے اُٹھالیا تھا اور ہندوستانی کسٹم اہلکاروں کے پاس لے جا کر رکھ دیا تھا۔ پاکستانی بارڈر والی سائیڈ پر آنے اور جانے والے مسافروں کے لیے امیگریشن کا کام ایک ہی بلڈنگ میں نمٹایا جاتا ہے جب کہ انڈیا کی طرف آنے اور جانے والے مسافروں کی امیگریشن کے لیے الگ الگ بلڈنگ ہے۔ جب ہم انڈیا سے پاکستان کی طرف گئے تھے تو پاکستان جانے والی سڑک کے بائیں طرف والی بلڈنگ میں افسروں کے سامنے پیش ہوئے تھے جب کہ اب قلی ہمیں سڑک کے دوسری طرف بنی بلڈنگ میں لے گئے تھے۔ انڈیا کی جانب سڑک بھی دو حصوں میں منقسم ہے۔ امیگریشن اہلکار کے پاس گئے تو اس نے ہمیں انڈیا میں داخلے کا فارم بھرنے کے لیے دے دیا۔ اس طرح کا فارم پاکستان کی طرف جاتے وقت ہمارے پاسپورٹوں میں سے لے لیا گیا تھا۔ اس فارم کے دو حصے تھے۔ فارم بھر کر دوبارہ امیگریشن والوں کے پاس گئے تو انہوں نے ہمارے پاسپورٹوں اور اُن فارموں پر مہریں لگائیں اور ہمیں واپس کر دیے۔ انہوں نے ہم سے کوئی سوال جواب نہیں کیا۔ ہم سمجھے کہ ہمارا کام ختم ہو گیا مگر قلی سامان اُٹھائے کسٹم والوں کے پاس لے گئے۔ کسٹم آفیسر وہی لڑکی تھی جس نے پاکستان میں

داخلے کے وقت ہمارے سامان کی چیکنگ کی تھی۔ اُس نے مسکرا کر ہمارا سواگت کیا۔ ہمارے فارموں پر دستخط کر کے ایک حصہ پھاڑ کر اپنے پاس رکھ لیا اور ایک حصہ ہمارے پاسپورٹوں میں لگا کر پاسپورٹ ہمیں واپس کر دیے۔

پتہ نہیں یہ ہماری عمر کا تقاضا تھا یا ہمارے پاس کینیڈین پاسپورٹوں کی موجودگی یا پھر پاکستانی بارڈر پر امیگریشن اور کسٹم آفیسر ہی اتنے ٹرینڈ کیے گئے تھے کہ مسافروں کے ساتھ بہت اچھا برتاؤ کریں۔ مسافروں کی طرف سے ان اہلکاروں کے خشک رویے کے بارے میں سنائے گئے قصوں کے اُلٹ ہمارے ساتھ جاتے وقت بھی اور اب آتے وقت ان کا رویہ بہت اچھا تھا۔ حلیمی بھرے بولوں کے ساتھ ساتھ انہوں نے ہمیں چائے پانی کا بھی پوچھا۔ یہاں ہمیں کاغذ پتر پر کرتے اور کسٹم کلیئر کرواتے تقریباً آدھا گھنٹہ تو لگ ہی گیا ہوگا لیکن ابھی تک پاکستان کی طرف سے سنیتا دھیر اور راج گھنٹہ بھر کے انتظار کے بعد ہمارے پاس پہنچے۔ ندیم پرمار نے لیٹ ہو جانے کی وجہ پوچھی ''ایک کسٹم اہلکار ڈیڈی کا شاگرد تھا۔ اُس نے زبردستی ہمیں چائے پلانے کے لیے روک لیا۔ ہماری کار یونیورسٹی میں کھڑی ہے۔ یہاں سے ہم سنیتا دھیر کی کار میں یونیورسٹی تک جائیں گے۔ آج ہمارا پروگرام امرتسر میں ٹھہرنے کا ہے۔'' راجو نے جواب دیا۔

ندیم پرمار کا خیال تھا کہ راجو کے ساتھ پھگواڑے تک جایا جائے اور کل موگا پہنچا جائے۔ اس خیال میں ترمیم کرتے ہوئے انہیں امرتسر کی طرف الوداع کیا اور ہم دونوں ٹیکسی لے کر تیسرے پہر موگا پہنچ گئے۔

